ذرّے

انتظار حسین



ذرّے

ذرّے

اِنتظار حُسین

پاکستان فاؤنڈیشن،

۶۵۔ شاہراہِ قائدِ اعظم، لاہور

تقسیم کنندگان

آئینۂ ادب، چوک مینار انار کلی، لاہور

اشاعت اوّل : ۱۹۷۶ء

مطبع : طفیل آرٹ پرنٹرز، لاہور

قیمت : دس روپے پچاس پیسے

ناشر

ریاض انور

سیکرٹری جنرل

پاکستان فاؤنڈیشن

۶۵۔ شاہراہِ قائدِ اعظم ۔ لاہور

عنایت اللہ مرحوم

کے

نام،

ڈیڑھ بات

جو شخص ان تحریروں کو ادب کے طور پر پڑھے گا وہ اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہوگا. میں نے یہ تحریریں اپنی پیشہ ورانہ حیثیت میں لیٹکل کالم لکھی ہیں۔

یہ انتباہ یوں ضروری ہے کہ فی زمانہ ادب اور صحافت کو بہت گڈمڈ کیا جا رہا ہے. بہت سے لکھنے والوں کو اصرار ہے کہ انکی صحافت کو ادب سمجھا جائے اور بہت سے لوگ لکھنے والوں سے ادب کے نام سے صحافت پیدا کرنے کا تقاضا کر رہے ہیں کہ ان کی دانست میں ادیب ان ذمہ داریوں کو جو اس سے صحیح یا غلط منسوب کی جاتی ہیں اسی طور پورا کر سکتا ہے۔ اور یہ کہ یہ واقعہ ادب اور صحافت کو گڈمڈ کرنے سے رونما نہیں ہوتا بلکہ ادب اور صحافت کی اپنی اپنی جدوجہد کی شناخت اور التزام سے رونما ہو سکتا ہے. سو آج کی صحافت ایسا واقعہ رونما ہونے کے امکانات بہت کم ہیں. اب ادب میں صحافت کے نمود کرنے کے امکانات زیادہ ہیں۔

بہرحال ایسی شاذ مثالوں کو بہانہ بنا کر اپنی صحافت کو ادب کے نام سے چالو کرنا دیانت نہیں ہے. دیانت اس میں ہے کہ ادیب کو اگر صحافت نگاری کرنی پڑ رہی ہے. تو وہ اپنی ادبی سرگرمی سے الگ اس کی شناخت رکھے. اسی میں اس کی سلامتی ہے۔

اس کی بھی، ادب کی بھی، اور صحافت کی بھی۔ صحافت کی اِس وجہ سے کہ صحافت نہ تو ادب کا بدل ہے نہ ادب کی کوئی ادنیٰ یا بگڑی ہوئی شکل ہے نہ ادب کا ضمیمہ ہے۔ صحافت بجائے خود ایک طرزِ اظہار ہے۔ اس طرزِ اظہار کی ادب سے الگ اپنی قدر و قیمت ہے۔ اس کی اپنی خوبیاں اور خرابیاں ہیں اور ادب سے افادیت کا تقاضا کرنے والوں کو کم از کم اتنا ضرور معلوم ہونا چاہیئے کہ جس قسم کی افادیت ان کا مطمحِ نظر ہے اسے صحافت ہی بطریقِ احسن پورا کر سکتی ہے۔ اس معاملہ میں اُدب صحافت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

میں نے یہ ڈیڑھ بات یہ سوچ کر کہی ہے کہ کوئی تو اپنی صحافت کو صحافت کہے، یہ کیا کہ ادیب کی صحافت کو بھی ادب سمجھا جائے اور اگر وہ کالم لکھ رہا ہے تو اسے تخلیقی کام بتایا جائے۔ میں یہ جانتے ہوئے کہ صحافت بجائے خود ایک طرزِ اظہار یا ایک صنف ہے اپنے کالموں کے اس انتخاب کو بغیر کسی شرمندگی اور معذرت کے پیش کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔

یہ کالم روزنامہ "مشرق" کی ملازمت کا احسان ہیں۔ دسمبر ۱۹۷۱ء تک کے کالموں میں سے یہ انتخاب ہے ہاں اُن کالموں کو جو شخصیتوں کے بارے میں لکھے گئے بالخصوص بتقریب تعزیت، انہیں جان کر اِس انتخاب سے الگ رکھا گیا ہے۔

ان کالموں کو پیش کرتے ہوئے مجھے "مشرق" کے بانی عنایت اللہ مرحوم کو ضرور یاد کرنا چاہیئے۔ اُن کی صحافیانہ نظر نے مجھے کالم کی یہ راہ سجھائی کہ شہر کی سماجی اور تہذیبی زندگی اپنی روزمرہ سطح سے اعلیٰ سطحوں تک اس میں اظہار پا سکے۔ اس میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو وہ میری اپنی کوتاہی ہے۔

انتظار حسین

ایک شہر کے سراغ میں

ارجنٹائن کا جدید شاعر اور افسانہ نگار بورخیس اپنی ایک نظم "بیونس آئرس کی اساطیری تاسیس" میں لکھتا ہے :-

"یہ یقین کرنا بے حد مشکل ہے کہ بیونس آئرس کا کوئی آغاز بھی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ اتنا ہی ازلی ہے جتنے ہوا اور پانی —"

بورخیس نے ان مصرعوں میں ایک ہنگاموں سے پُر شہر کے درمیان اپنے فنّی ادراک میں ایک نیا شہر تعمیر کیا ہے۔ محسوسات کے پھیلاؤ نے اس شہر کی حدیں ازل سے ملادی ہیں اب یہ شہر ہوا اور پانی کا ساتھی ہے۔ گویا پوری کائنات کی تعمیر میں شامل ہونے والے بنیادی عناصر کی طرح فعال اور آزاد —

جو شہر تہذیبی زندگی کا مرکز ہوں اور جو زمانوں کی یورشوں اور صدیوں کی تُند آندھیوں کے درمیان قائم و دائم ہوں ان کی حدیں ازل سے مل ہی جایا کرتی ہیں۔ لاہور کی حد بھی ازل کی حد ہے۔ ہوا اور پانی کی طرح یہ بھی ہماری کائنات کا ایک بنیادی عنصر

ہے۔ اس شہر کے اُفق پر شاموں کو گزری ہوئی صدیوں کی شفق پھیلتی ہے۔ موسم گرما کی دوپہروں میں چلتے ہوئے زمانے اس شہر کی زیارت کو آتے ہیں۔ اور موسم سرما کی سہ پہر تاریخ کے ٹھنڈے دنوں کا نشان بن کر آتی ہے۔ برسات کی کالی راتوں میں چمکنے والی بجلیاں پچھلے وقتوں کی جنگوں کی داستان دہراتی ہیں اور بہار کے دنوں کی سبز شامیں اور ہوائیں جھومتے ہوئے اشجار آنے والے موسموں کی پیش گوئیاں کرتے ہیں۔

قہرمان اور مہربان موسموں کے درمیان تاریخ نے کتنی ہی صدیاں گزار دیں۔ کتنے ہی قافلے اور لشکر گزرے۔ لوگ اِس شہر کو آنکھ کے تِل میں بسا کر سفر بھی کرتے رہے اور دور دور سے دھول میں اَٹے مسافر آتے بھی رہے۔ یہ سب کچھ ہو چکا تو ہماری باری آئی۔ اب شہر کی فصیل کے حصار میں تمام منظر بدل چکے تھے پُرانی گلیاں خستگی کا نشان تھیں۔ مغلوں کے قلعے اور ان کی بنائی ہوئی دوسری عمارتیں کہنہ ہو چکی تھیں۔ ان کی منڈیروں پر لمبی گھاس اُگ آئی تھی۔ اداسی ان کی دیواروں پر بال کھولے سو رہی تھی۔ سات سمندر پار کے تاجر لٹیروں نے اِس خطے کے تمام شہروں کو لوٹا تھا۔ اب اِس شہر کے حصار میں ان کی بنائی ہوئی عمارتیں بھی تھیں اور ان کا لایا ہوا طرزِ تمدن بھی تھا۔ پھر اسی شہر میں "قراردادِ پاکستان" کی صورت میں ان لٹیروں کو اِس خطے سے نکالنے کا عزم بھی باندھا گیا، اِسی شہر کے بڑے دروازے سے ہمارے بزرگ اس خطے میں داخل ہوئے تھے اور یہی شہر اب ہماری تہذیبی روح کی پناہ گاہ ٹھہرا۔ اجتماعی تاریخ کے اس نئے موڑ پر لٹے پٹے قافلے اور بے نوا مسافر آئے۔ اور تازہ بستیاں آباد کرنے کے خواب دیکھے گئے۔ خواب دیکھنا ایک مرحلہ تھا اور خواب کو

تعبیر میں ڈھالنے کا مرحلہ دوسرا تھا۔ دوسرا مرحلہ پہلے مرحلے سے بھی زیادہ کٹھن تھا۔

"پاکستان" ہماری تہذیبی روح کے لیے جسم تھا اور روح جسم کی اس وحدت سے ہماری قومی شخصیت کی یکتائی قائم تھی۔ اِس مرحلے پر آنے والے مسافروں کے درمیان میرٹھ کے نواح سے آنے والا انتظار حسین بھی تھا۔ جو اسی شہر کا ہو رہا۔ پیشہ ہمیشہ سے خبریں جمع کرنا، کالم لکھنا اور رسالوں کی ادارت کرتا رہا۔ شوق البتہ بہت سے رہے اور اب تک ہیں، افسانے ڈرامے اور مضامین لکھنا، ترجمے کرنا، شہر کے درختوں کی وکالت، ادبی انجمنوں کے اسکینڈل، فقرے بازیاں، دوستیاں کم اور دشمنیاں زیادہ ــــ بس اسی طور یہ ربع صدی گزر گئی۔ اس ربع صدی میں تاریخ کے کئی جھگڑے تیزی سے گزرے اور اب سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد ہم تجزیہ کرنے بیٹھے ہیں کہ ہمارے ساتھ کیا قیامت گزری کس کس نے دھوکا دیا۔ اور کس کس فریب میں ہم مبتلا رہے۔

اس ربع صدی میں سطح بینی ہمارا شعار ہوئی۔ تہذیب اور تہذیبی مظاہر اسی سطح بینی کی وجہ سے بے توجہی کا شکار ہوئے۔ عمارتوں کی منڈیروں پر لگی ہوئی کائی بھی صاف نہ ہو سکی۔ لیکن ساتھ ہی ہماری روحوں کے شہروں کی عمارتیں کائی لگی دیواروں کی طرح کالی پڑتی گئیں۔ شہروں میں کارخانے اور بنکوں کی عمارات بنوا کر ہم مطمئن ہو گئے۔ ہر سڑک کو مختلف مصنوعات کے روشن اشتہارات سے سجا دیا اور ہمارے اندر جو اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ علم و دانش اور تہذیب اب بنجر کاروباری ذہنوں کے تصرف میں تھے۔ رشوت، سمگلنگ، چور بازاری، جعلی ڈگریاں، فاحشاؤں کا عروج اور قاتلوں کی

حکمرانی۔ یہ دور بند تھا تو معاشرے کے باطن میں اقتدار کی تعمیریں مسمار ہوتی گئیں۔ ایسے ہی وقت میں منیر نیازی نے کہا ہے

اُگا سبزہ در و دیوار پر آہستہ آہستہ
ہُوا خالی صداؤں سے نگر آہستہ آہستہ
چمک زر کی اُسے آخر مکانِ خاک میں لائی
بنایا ناگ نے جسموں میں گھر آہستہ آہستہ
منیرؔ اِس مُلک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

اور یہی دور تھا جب انتظار حسین نے اپنے افسانوں میں اُن بستیوں کی باتیں شروع جو اپنے اعمال کی سزا کے طور پر بندروں کی بستیوں میں تبدیل کر دی گئیں۔ اُن مُردوں کا ذکر شروع کیا جو زندہ لوگوں کا رزق کھا جاتے ہیں۔ پھر یہ ذکر جاری رہا۔ شخصیت کی پہچان گم ہونے کا ذکر۔ انسانوں کے مکھی، بندر میں تبدیل ہونے کا ذکر۔ حرص اور طمع کے "زرد کُتے" کا ذکر۔ اس طرح کی باتیں اس عہد میں جس نے بھی کیں اسے عقل دشمن کہہ کر پرے ڈال دیا گیا۔ کہا گیا کہ یہ شخص معاشرے کا دشمن ہے اسی لئے مایوسی پھیلا رہا ہے۔ اس طرف دھیان نہ گیا کہ کسی روز شخصیت کی تہ میں مایوسی کا یہ سیم نالہ پھوٹ گیا تو کیا ہوگا۔ جب یہی نہ مانا جائے کہ کسی سطح پر کوئی گڑبڑ موجود ہے تو اس کا تدارک کیسے کیا جا سکتا ہے ۔

انتظار حسین کی بنیادی حیثیت افسانہ نگار کی ہے اور اس کے کالم افسانوں کا بدل نہیں لیکن یہ ایک ہی طرزِ احساس کی دو صورتیں ہیں۔ ان کالموں میں شہر کی مختلف تصویریں ہیں۔ دانشوروں کی تصویریں، ادبی جلسوں کی تصویریں، مذاکروں، بحثوں اور مجمعوں کی رُوداد جنگ کے دنوں اور بدلتے ہوئے موسموں کی تصویریں، جنازوں کی تصویریں اور رفتگاں کا ماتم، غرضیکہ ایک شہر کی بارہ چودہ سال کی کتھا۔ ان تصویروں کے پس منظر میں قومی تاریخ کے مختلف مراحل بھی ہیں اور ان مرحلوں پر مختلف طرح کا ردِ عمل بھی ان کالموں کا موضوع ہے۔ ان کالموں سے شہر کی جو تصویر بنتی ہے اس میں خاموشی کے منطقے گم ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ شور پورے منظر پر چھایا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور مسائل کی تعداد بڑھتی نظر آتی ہے۔ بہتر ہے کہ ان کالموں کی حدود کو شروع ہی سے پہچان لیا جائے۔ انتظار حسین کا موضوع شہر کی تہذیبی زندگی ہے۔ اسی لئے اس کی رسائی زیادہ تر ادبی انجمنوں کے جلسوں اور ثقافتی تقریبات میں ہوتی ہے۔ سیاسی جلسوں یا جرائم پیشہ ماحول، منشیات کے اڈوں، بھک منگوں اور یتیم خانوں کی تصویریں بہت کم دکھائی ہیں، یہ اس کا موضوع ہی نہیں وہ تو تہذیبی زندگی کے مختلف واقعات کو نقل کرتا ہے اور اسی حوالے سے شعور اور طرزِ احساس کی تبدیلیوں کو سامنے لاتا ہے۔ ان کالموں میں موتیے کے پھول بیچنے والے، پنواڑی، تہوار منانے والے، دانشور اور دوسرے کردار اس وسیع تہذیبی پس منظر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی تصویروں پر مبنی یہ کالم ڈکنز کے ناولوں کی وسیع کائنات کی طرح شہر کی مربوط داستان نہیں بن سکتے کیونکہ یہ چیز کالم نگاروں کی حدود سے باہر ہے البتہ

یہ چھوٹی چھوٹی تصویریں مل کر ایک مجموعی تاثر بناتی ہیں اور ایک تہذیب کے بکھرنے کی داستان کہتی ہیں۔

انتظار حسین کا بنیادی موقف یہ ہے کہ جب تہذیبی مظاہر بے توجہی کا شکار ہو جائیں تو پورا معاشرہ بے سمت ہو جاتا ہے۔ اور جب روحانی زندگی بنجر ہونے لگے تو خارج میں بھی رستہ گم ہو جاتا ہے۔ یہ بنیادی موقف اُس نے طنز، دلگدازی، ظرافت اور نوحے کے مختلف پیرایوں میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ انتظار حسین کو مرقع نگاری میں کمال حاصل ہے۔ خاص طور پر مجمعوں کی تصویر کشی میں۔ اس سلسلے میں کہیں کہیں سرشار کی سی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے۔ طنز اور بامعنی ظرافت کے ساتھ ساتھ ایک اور انفرادیت اس کے اسلوب میں داستانی نثر کی آمیزش ہے۔ یہ اندازِ تحریر بھی دراصل محض دل لگی کے لئے نہیں مذکورہ تہذیبی اندازِ فکر کا حصّہ ہے

"لاہور نامہ" کے عنوان سے روزنامہ "مشرق" میں لکھے گئے کالموں کا یہ انتخاب سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحے کے متعلق لکھے گئے کالموں پر ختم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس واقعے کے ساتھ ہماری قومی اور تہذیبی زندگی کا ایک باب ختم ہوا۔

یہ کالم محض روزمرہ واقعات کا بیان نہیں نہ ہی یہ محض "موعظہ حسنہ" ہیں۔ یہ تو تہذیب کے ٹوٹے ہوئے آئینے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں۔ آیئے ان ٹکڑوں کو جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ شاید اپنے آپ سے آشنا ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہو۔

لاہور، ۲۰ ستمبر ۱۹۷۳ء — خاں

تہذیبی مظاہر

شرافت اور شاعری

شہرت بخاری کچھ اپنے متعلق پڑھ رہے تھے۔ اور ناصر کاظمی سخت پریشان تھے۔ آخر ان سے رہا نہ گیا۔ انھوں نے بڑی تشویش سے مجھے کہا۔ یہ شہرت بخاری سخت سادہ آدمی ہے۔ کہیں لکھنے والے اپنی کمزوری کا برسرِ عام اعتراف کیا کرتے ہیں۔ اگر وہ شریف آدمی ہے تو دوستوں کے کان میں کہہ دیتا۔ محفل میں آ کر تو نہ بتاتا۔

یہ اس محفل کا ذکر ہے جو اسلامیہ کالج سول لائن میں جمعہ کی شام کو منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر نذیر صدارت کر رہے تھے۔ اور چار شاعر احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی، شہرت بخاری اور سجاد باقر رضوی یہاں اس غرض سے بلائے گئے تھے کہ پہلے وہ اپنے اور اپنی غزل کے متعلق کچھ کہیں پھر تو نے کی غزلیں سنائیں۔ سو 'میری غزل' کے عنوان سے کسی نے مضمون پڑھا اور کسی نے زبانی گفتگو کی۔

شہرت بخاری کی تحریر میں اڑتا اڑتا سا ذکر شرافت و نجابت کا بھی آ گیا تھا۔ اور ناصر کاظمی سرگوشی میں کہہ رہے تھے۔ "میرا باپ مجھ سے زیادہ شریف آدمی تھا مگر وہ

شاعر نہ بن سکا۔"

میں چاہتا تھا کہ شہرت بخاری کی باتیں یکسوئی سے سنوں مگر ناصر کاظمی مجھے شرافت اور شاعری کا باہمی تعلق سمجھانے کے درپے تھے۔ وہ اس بات پر زور دے رہے تھے کہ اگر کوئی شاعر بد قسمتی سے شریف واقع ہوا ہے تو شرفا میں اُسے اپنا بھید نہیں کھولنا چاہیئے۔ شاعری کے اندر بھی یہ بھید نہیں کھلنا چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ غزل میں شرافت اُوپر تیرتی نظر آئے۔

شہرت بخاری کے بعد جب ناصر کاظمی نے اپنی گفتگو شروع کی تو میں نے نہایت توجہ سے ساری گفتگو سنی۔ میرا خیال تھا کہ شاعری اور شرافت کے باہمی تعلق کے مسئلہ نے انہیں اکسا دیا ہے وہ اس پر کھُل کر کوئی بات کریں گے۔ مگر ناصر کاظمی ٹیبل ٹاک مرد ہیں۔ سٹیج پر انہیں کھڑا کر دیجیے تو وہ یوں اٹکتے ہیں جیسے آٹھویں کلاس کا طالب علم رٹ کر سٹیج پر پہنچے اور ہر فقرہ کے بعد یاد کرے کہ دوسرا فقرہ اس نے کون سا رٹا تھا۔

ہمعصروں کے متعلق کچھ گفتگو شہرت بخاری نے کی تھی۔ کچھ ناصر کاظمی نے کی۔ اور مجھے اب سے تھوڑے سال پہلے کا وہ وقت یاد آرہا تھا جب اس شاعر نے اعلان کیا تھا کہ میرا ہمعصر تو سرسوں کا پھول ہے۔

سرسوں کے پھول کا ہمعصر اس وقت اپنے سینئر اور جونئیر سب شاعروں کو خراج پیش کر رہا تھا۔ اور ہمارے برابر بیٹھے ہوئے ایک باخبر قاری نے چپکے سے کہا

کہ سرسوں کے پھول ان دنوں پھول رہے ہیں۔ مگر لگتا ہے کہ ناصر کاظمی کی شاعری کی بسنت گزر گئی۔

یوں لگتا تھا کہ ناصر کاظمی نے یہ بات سن لی۔ انہوں نے پھریری لی اور یوں گویا ہوئے کہ "صاحب میری شادی کے بعد میرے ایک دوست نے کہا تھا، کہ ناصر کاظمی تو مر گیا۔ اس کے دوسرے دن میں نے اٹھارہ شعر کی غزل لکھی جو پیش کرتا ہوں۔ آپ خود فیصلہ کر لیں کہ میں مر چکا ہوں یا زندہ ہوں"۔ اور اس کے بعد انہوں نے آنکھیں بند کر کے اپنی غزل شروع کر دی۔

اس بیان پر مجھے دھیان آیا کہ ناصر کاظمی کے اس رومانٹک دوست نے ناصر کاظمی کو دیکھ کر ہمت پکڑی اور خود بھی شادی کر ڈالی۔ مگر ناصر کاظمی اس کے مرنے جینے کے متعلق کوئی اعتراف کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ بس یہ کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں:
"یار اس شریف آدمی کے یہاں کوئی فرق نہیں پڑا۔ جیسا پہلے تھا ویسا ہی اب بھی ہے"۔

یہ محفل ابھی جاری تھی کہ روزے کا وقت آ گیا۔ اور افطار کے لئے یاروں کا باہر جانا غضب ہوا۔ جب وہ واپس آئے تو دیکھا کہ بجلی بجھی ہوئی ہے اور دروازے میں تالا پڑا ہے۔ یہ احوال جب ان شاعروں نے دیکھا جنہوں نے ابھی اپنا کلام نہیں سنایا تھا تو ان کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی مگر سامعین کچھ مطمئن سے نظر آتے تھے سب سے زیادہ اطمینان کا اظہار صدر نے کیا اور تجویز پیش کی کہ باقی کو پھر سن لیں گے منتظمین کی غیرت نے اس تجویز کو گوارا نہ کیا۔ چپراسی کی تلاش سرگرمی سے شروع

ہوئی۔ اور ہم دل میں ڈرے کہ واپسی تراویح کے بعد ہوئی تو کیا ہوگا۔ مگر ایک طالبعلم دوڑا دوڑا مسجد گیا اور چابی لے کر ہی واپس آیا۔

ویسے چیڑاسی کا ردِ عمل بہت زیادہ نادرست نہیں تھا۔ اس محفل میں شاعروں نے سامعین کی توقعات کو پورا نہیں کیا۔ ناصر کاظمی کی گفتگو رسمی سی تھی۔ شہرت بخاری نے ذاتی باتیں تو بہت کیں مگر ذاتی باتیں معنی اس وقت اختیار کرتی ہیں جب لکھنے والا اپنے کام سے ان کا رشتہ دکھائے۔

احمد ندیم قاسمی نے بہت سلیقہ سے باتیں کی تھیں کچھ غزل کے بارے میں۔ کچھ اپنے ادبی نقطۂ نظر کے بارے میں۔ مگر یہاں سے بھی کوئی ایسا بیان نہیں آیا۔ جو اُن کی شاعری کے بارے میں ہمیں نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کرتا۔

معروف شاعروں کی زندگی اور ان کے نقطۂ نظر کے بارے میں ان کے قارئین ان کے مطالعہ کے دوران بہت کچھ جان لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب ان سے اپنے متعلق گفتگو کرنے کا تقاضا کیا جاتا ہے تو حالاتِ زندگی بیان کرنے اور نقطۂ نظر کی وضاحت سے زیادہ کی توقع کی جاتی ہے۔ پڑھنے والے اس طرح شاعر کے تجربات و واردات کی اقلیم میں براہ راست داخل ہونا چاہتے ہیں۔ تاکہ اس راستے وہ شاعری کی تہہ تک پہنچ جائیں۔ مگر اس محفل میں اپنی اس اقلیم میں داخل ہونے کی کسی شاعر نے اجازت نہیں دی۔ جیسے اُنھوں نے یہاں تختی لگا رکھی ہو کہ :

یہ شاہراہِ عام نہیں ہے۔

(۲۰ ۱/۴۲)

چاند، جو ابھی زندہ ہے،

سوال یہ تھا کہ چاند ۲۹ کا ہوگا یا ۳۰ کا ہوگا۔ اِس سوال کے ساتھ ساتھ نگاہیں زمین سے اُٹھیں اور آسمان تک گئیں۔ آسمان ابر آلود تھا۔ کیا جمعہ کی شام کو مطلع صاف ہوگا؟ یاس و آس میں گھری ہوئی سینکڑوں نگاہیں آسمان کو ٹٹولتی رہیں اور کچھ طے نہ کر سکیں۔

آسمان آج بھی مسلمانوں کے ساتھ وہی کر رہا ہے جو سینکڑوں برس سے کرتا چلا آیا ہے۔ کبھی مطلع ابر آلود ہوتا ہے کبھی مطلع صاف ہوتا ہے۔ مگر چاند بال سے زیادہ باریک ہوتا ہے۔ کسی باریک بیں کو نظر آتا ہے۔ اس کے بیان پر کوئی اعتبار کرتا ہے کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ پھر اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور کبھی اتنا طول کھینچتے ہیں کہ ایک ہی شہر میں دو عیدیں ہو جاتی ہیں۔

عید بعد میں آتی ہے اس سے پہلے تذبذب کے مراحل آتے ہیں۔ کبھی اس امید میں کہ چاند ۲۹ کا ہوگا بہت سا دودھ خرید لیا جاتا ہے اور چاند نہیں ہوتا تو اس

دودھ کو سنگھوانا مشکل ہو جاتا ہے کبھی بھروسہ کیا جاتا ہے کہ چاند ۳۰ کا ہوگا، دودھ نہیں خریدا جاتا۔ مگر چاند ہو جاتا ہے اور بڑے برتن لے کر دودھ کی تلاش میں نکلتے ہیں، اور چھوٹے آستینیں چڑھا کر درزی سے لڑنے چلتے ہیں

ہماری غیر ڈرامائی زندگی میں یہ ڈرامہ برس کے برس آتا ہے۔ عید اسی ڈرامے کا نقطۂ عروج ہے۔ مگر اب روشن خیالوں کا ایک گروہ پیدا ہوا ہے جو کہتا ہے کہ ڈرامے کو منہا کر دو۔ بس نقطۂ عروج کو باقی رہنے دو۔ عید کے بارے میں اختلاف رائے ان کی دانست میں ملت کے انتشار کا مظہر ہے اور آج کے سائنسی دور میں آنکھ سے چاند دیکھنے پر اصرار کرنا رجعت پسندی کی دلیل ہے

عجب بات یہ ہے کہ جب ملت متحد تھی اور مسلمان ملک پہ ملک فتح کر رہے تھے۔ عید کے بارے میں یہ ہنگامہ آرائی اس وقت بھی اسی طرح تھی۔ کسی فاتح اور کسی مصلح نے یوں نہیں سوچا کہ چاند کے بارے میں اختلاف ملت میں انتشار پیدا کرے گا۔

اس سے بھی عجیب بات ایک اور ہے۔ ایک رہنما نے تضحیک کی کہ اس سائنسی دور میں لوگ آنکھ سے چاند دیکھنے پر اصرار کر رہے ہیں اور اسی برس کی بات ہے کہ کراچی اور لاہور کے گورنمنٹ کالجوں سے سینکڑوں طالب علم یہ کہہ کر واپس کر دیے گئے کہ آپ کے لئے ہم سائنس کی تعلیم کا بندوبست نہیں کر سکتے۔ یعنی کہ

ناطاقتی کے طعنے ہیں اور کس ادا کے ساتھ

سائنس کی تعلیم کا بندوبست نہیں کیا جائیگا مگر سائنسی شعور کا تقاضا بہر حال کیا جائے گا۔

یہ سائنسی شعور کا تحفہ ہمارے لئے انگلستان سے آیا ہے۔ مگر انگلستان ہی میں بیسویں صدی کے شعور کے پیٹ سے ڈی ایچ لارنس پیدا ہوا تھا جس نے اس بات پر بہت نوحہ کیا ہے کہ یورپ میں چاند اور سورج مر گئے ہیں۔ اور ستاروں اور آسمان سے لوگوں کا جیتا جاگتا تعلق باقی نہیں رہا۔

پاکستان کی زمین کا آسمان ابھی تک ایک دھڑکتی ہوئی حقیقت ہے۔ اور چاند تارے زندہ چیزیں ہیں۔ شق القمر سے لے کر رویت ہلال عید تک کی روایت نے چاند میں ہمارے لئے بہت سے معنی پیدا کئے ہیں۔ عید کے گرد رسموں کا ایک جھرمٹ ہے اور چاند رات اتنی ہی بڑی تقریب ہے جتنی صبح عید۔

اور ۲۹ کی شب کو رویت ہلال کا اعلان سن کر میں تھوڑا ڈرا کہ روایت اگر یہی بننی ہے تو ۲۹ کی شام کو ہمارے مکانوں کی چھتیں اور ہماری گلیوں نکڑ کتنے سنسان ہوا کریں گے۔ اور چاند دیکھ کر دعا مانگنے کی رسم بس پرانی داستانوں میں باقی رہ جائے گی۔

اور کل رمضان کی آخری شب تھی اور ہماری گلی میں فقیر آج یہ دوہا زیادہ دکھ کے ساتھ پڑھتا گذرا ؎

پتہ ٹوٹا ڈال سے لے گئی پون اڑائے

اب کے بچھڑے کب ملیں دور پڑے ہیں جائے

اور سحر خیزیوں کی عجب تقدیر ہے۔ جب رمضان کا آغاز ہوتا ہے تو روزہ تہ رکھنے

والوں کو ان کی آوازیں بہت گراں گذرتی ہیں. ہر شخص شکایت کرتا نظر آتا ہے کہ جگانے والے سونے نہیں دیتے.

رفتہ رفتہ کان عادی ہو جاتے ہیں، اور سحر خیزیوں کی آوازیں ہماری راتوں کے آہنگ میں گھل مل جاتی ہیں. مگر یہ عمل پورا ہوتے ہی رمضان کا چل چلاؤ شروع ہو جاتا ہے. اور پھر خواہ مخواہ ان آوازوں سے ایک رقت آمیز لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے. جیسے کوئی وداع ہونے کو ہے. اور ہم اسے روک نہیں سکتے. یوں سحری کا وقت ہنسی خوشی کا وقت ہوتا ہے. مگر آخری سحری ایک ہلکی سی رقت اپنے ساتھ لاتی ہے. اور سحر خیزیوں کی آوازیں یاس بھری نظر آتی ہیں. اور الوداعی نغمہ کا روپ دھار لیتی ہیں۔

(۱۷ ۲/۴)

چندہ، چائے اور ادب

پاکستان رائٹرز گلڈ کے چاند سورج کی جوڑی لاہور میں پھر طلوع ہوگئی ہے۔ جب ابنِ انشا شہر میں نمودار ہوں تو انہیں آپ جمیل الدین عالی کی آمد کی پیشگوئی سمجھیں اور ابنِ انشا کے منہ سے ہم نے ہمیشہ یہی معذرت سُنی کہ یار مکان کا جھگڑا تھا۔ اس کے سلسلہ میں آنا پڑ گیا۔ واضح رہے کہ اُردو شاعری کی تاریخ میں مکان کے تین قضیے ہوئے ہیں، ایک غالب کے مکان کا قضیہ ایک ناصر کاظمی کے مکان کا قضیہ، ایک ابنِ انشا کے مکان کا قضیہ۔ اوّل الذکر قضیہ میں غالب نے بہت مقدمے لڑے۔ اور جیسے تیسے قصہ طے کرالیا۔ مگر موخر الذکر دو قضیے تادمِ زندگی طے ہوتے نظر نہیں آتے۔ اس ملک میں جب سے الاٹمنٹ شروع ہوئے ہیں ہم ان دو شاعروں سے یہ عُذر سُن رہے ہیں کہ مکان کا جھگڑا پڑا ہُوا ہے سو کہاں کی رباعی کہاں کی غزل۔

اصل میں لاہور میں آنے کے بہت سے راستے ہیں۔ مکان کے راستے

سے ابنِ انشاء یہاں پہنچے ایک اور راستے سے جمیل الدین عالی یہاں آئے۔ مگر یہ
دونوں راستے پرنسز ہوٹل میں جا کر مل گئے۔ جہاں رائٹرز گلڈز کا دفتر واقع ہے۔
اور بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات تو گذر گئے کسی ادیب کو اس کی خبر ہوئی کسی
کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ مگر اب رائٹر گلڈ کے انتخابات سر پہ ہیں اور انتخابات ہمیشہ نئے تو تو میں
کی تقریب ہوتے ہیں۔ تو ایک روز جب ہم آنکھیں ملتے اُٹھے اور اخبار کھولا تو ایک
جماعت کی طرف سے یہ بیان چھپا دیکھا۔ کہ رائٹرز گلڈ نے نظریاتی بنیادوں پر تین
سو ادیبوں کو نکال باہر کر دیا۔ اور علاقائی زبانوں کے ادیبوں کا تو صفایا کر دیا۔ اس خبر
میں ناموں کا ایک سلسلہ تھا۔ فیض احمد فیض، باقی بلوچ، حبیب جالب اور ہمارے
قدموں تلے سے زمین نکل گئی کہ کیا ادیبوں کی سکریننگ شروع ہو گئی۔ مگر اسی فہرست
میں حفیظ جالندھری، سید امتیاز علی تاج اور نسیم حجازی کے بھی نام آ گئے۔ اور خبر کا
مجموعی تاثر مجروح ہو گیا۔ اور علاقائی زبانوں کے ادیبوں کا نام ہم نے اس فہرست
میں بہت ٹٹولا۔ مگر جس نام کو ہاتھ لگایا وہ اُردو کا ادیب نکلا۔ اور تب ہم نے سوچا
کہ یار لوگ جماعتیں بھی قائم کر لیتے ہیں اور بیان بازی بھی کرتے ہیں مگر بیان کو اخباری
طور پر موثر بنانا نہیں جانتے۔ اصل میں اس بیان سے جو تاثر پیدا کرنے کی کوشش
کی گئی تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ حفیظ جالندھری، سید امتیاز علی تاج اور نسیم حجازی کے
نام گول کر دیئے جاتے۔ ان ناموں سے خبر کا تاثر بگڑ گیا اور بیان کا مقصد فوت ہو گیا۔
دوسرے دن جب جمیل الدین عالی کا بیان پڑھا تو ہمیں بالکل ایسا لگا کہ عالی

صاحب کراچی سے لاہور محض وضاحتی بیان دینے کے لئے آتے ہیں۔ اور لاہور والوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ فیض صاحب کا حلقہ بدل گیا ہے۔ پہلے وہ لاہور کے حلقہ میں تھے۔ اب کراچی کے حلقہ میں ہیں۔ اس لئے رائٹرز گلڈ کی فہرست میں ان کے نام کا شامل ہونا چنداں تعجب خیز نہیں۔

اس بیان کو پڑھ کر ہم نے شائع شدہ فہرست کو غور سے پڑھا اور اپنے جیسے بہت سے ادیبوں کا نام غائب پایا تو گمان کیا کہ شاید ان سب ادیبوں کا حلقہ بدل گیا۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ فیض صاحب کا حلقہ بدل گیا تو سمجھو کہ یاروں کا بھی حلقہ بدل گیا۔

مگر جب تحقیق کی تو پتہ چلا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ یار لوگ گلڈ کے ممبر تو بنے ہوئے تھے مگر چندہ ادا نہیں کرتے۔ ایک تو ممبری کا چندہ نہ دینا اور پھر گلڈ کے سینے پر مونگ دلنا، بات بات پر اعتراض کرنا، ہر کام میں کیڑے ڈالنا۔ چندہ نہ دینے والے بہت دنوں تک گلڈ کے منہ کی چھچھوندر بنے رہے کہ وہ انہیں نگلے تو اندھا اور اُگلے تو کوڑھی۔ مگر جب انتخابات قریب آئے اور چندہ نہ دینے والوں نے چندہ نہیں دیا تو پھر گلڈ نے تین سو ادیب اُگل دیئے۔

ویسے ہمیں تعجب اس پر نہیں کہ ایک نہ دو اکٹھے تین سو ادیبوں نے گلڈ کا چندہ نہیں دیا تھا۔ تعجب اس پر ہے کہ اچھا ایسے بھی ادیب ہیں جو چندہ ادا کر رہے تھے۔

بات یہ ہے کہ چندہ ادا کرنا ادیبوں کی روایت میں شامل نہیں۔ اردو ادیبوں کی برادری میں ایک شخص ایسا ضرور گذرا ہے جس نے بہت چندہ جمع کیا اور اگرچہ

دیندار مسلمانوں نے بہت احتجاج کیا مگر اس شخص نے طوائفوں سے بھی چندہ وصول کرنے میں تکلف نہیں کیا۔ یہ سر سید احمد خاں تھے۔ مگر تاریخ میں کسی ایسے ادیب کا نام نہیں ملتا جس نے کبھی چندہ ادا کیا ہو۔ ہم نے ایک سابق ترقی پسند سے چپکے سے پوچھا کہ "یار تمہاری انجمن ترقی پسند مصنفین میں ادیب چندہ دیتے تھے۔؟"

اس نے جواب دیا کہ "یوں تو چندہ نہیں دیتے تھے۔ مگر جس کسی نے چندہ دیا وہ اکٹھا ہی دیا۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ وہ جیل چلا گیا۔"

پھر ہم نے حلقۂ اربابِ ذوق والوں سے پوچھا کہ تم چندہ ادا کرتے ہو۔؟ انھوں نے جواب دیا کہ برادر ہم حلقے کے لئے تو کوئی چندہ وندہ نہیں دیتے۔ مگر ہر ہفتے جلسہ کے بعد ہمیں چائے کے لئے چندہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور موقف حلقۂ اربابِ ذوق کا یہ ہے کہ ادب چندوں سے بے نیاز ہے۔ چندے سے ادب پیدا نہیں ہوتا۔ چندے سے صرف چائے پی جاسکتی ہے۔

تو ہم نے بصد ادب جمیل الدین عالی صاحب سے گذارش کی کہ حضرت سر سید احمد خاں کے وقت سے اب تک ہماری برادری میں سے کبھی کسی نے چندہ ادا نہیں کیا۔ ہم روایت سے بغاوت کیونکر کریں۔ مگر جمیل الدین عالی کا استدلال یہ ہے کہ سر سید احمد خاں کے وقت سے ابتک کبھی معذور ادیبوں کی امداد کا بھی تو بندوبست نہیں کیا گیا تھا۔

ٹماٹر بھی جذبات رکھتے ہیں'

ٹماٹروں کے بھی جذبات ہوتے ہیں. مگر ٹماٹر شاعر نہیں ہوتے۔

یہ استدلال ناصر کاظمی کا تھا حلقۂ اربابِ ذوق کے جلسہ میں ایک دانشور نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ نئی شاعری میں معنی تلاش مت کیجئے۔ وہاں تو جذبہ کی ایک زیرینی رو ہوتی ہے۔ اس رو سے آپ کا سمجھوتہ ہو جائے تو وہ شاعری آپ کے لئے بامعنی ہے ورنہ بے معنی۔

ناصر کاظمی بولے کہ 'جذبہ کی زیرینی رَو تو ٹماٹر میں بھی ہوتی ہے مگر اس سے ہمارا سمجھوتہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ٹماٹر ٹماٹر ہی رہتا ہے شاعر نہیں بنتا'۔

اس بیان کو چیلنج کیا گیا تو ناصر کاظمی جدید سائنسی تحقیقات سے سند لائے۔ واضح ہے کہ ناصر کاظمی کو ادب کے میدان میں کم اور سائنس کے میدان میں زیادہ دعوے ہیں. جیسا کہ خود اُن کا بیان ہے۔ اُنھوں نے نباتات اور حیوانات کے بارے میں تحقیقی کام کر رکھا ہے۔ پس اُنھوں نے معترضین کے جواب نہایت اعتماد سے دیئے اور کہا

کہ ٹماٹروں کے بھی جذبات ہوتے ہیں. ٹماٹر ذی حس مخلوق ہیں۔ جب انھیں چاقو سے کاٹا جاتا ہے تو انھیں تکلیف ہوتی ہے.

ناصر کاظمی تو خیر سائنس داں ہوئے وہ باتیں ٹیکنیکل کر رہے تھے۔ مگر مجھ جیسے عامی ان باتوں سے جو نتائج مرتب کر سکے وہ یہ ہیں :

ٹماٹر کے بھی جذبات ہوتے ہیں آدمی کے بھی جذبات ہوتے ہیں. ٹماٹر اور آدمی میں فرق یہ ہے کہ ٹماٹر چاقو سے کاٹا جاتا ہے اور وہ تڑپ کر رہ جاتا ہے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر پاتا. آدمی اپنے جذبات کا اظہار بھی کرتا ہے جذبات کے اظہار کی بنا پر آدمی شاعر بن جاتا ہے. ٹماٹر شاعر بنتے بنتے رہ جاتا ہے.

میں نے جب اس استدلال پر غور کیا تو ٹماٹر کو آدمی سے افضل پایا. ٹماٹر کے یہاں ضبطِ نفس پایا جاتا ہے. آدمی کے یہاں ضبطِ نفس نہیں. آدمی کبھی شاعری کرتا ہے، کبھی راگ چھیڑتا ہے، کبھی محض چیختا چلاتا ہے مگر ٹماٹروں کو اپنے جذبات پر اتنا قابو ہے کہ وہ اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کرتے. چاقو سے کٹتے ہیں تو تڑپ کر رہ جاتے ہیں. زبان سے اُف نہیں کرتے.

یہ دلیل اصل میں چند برس پہلے کے زمانے کی یادگار ہے. ایک طرف تجریدی آرٹسٹ اور دوسری طرف ناصر کاظمی والی نئی نسل اپنا وجود منوانے کے لئے نرالی دلیلیں لا رہی تھی. پنجاب یونیورسٹی میں حنیف رامے نے اپنی تصویروں کی نمائش کی. ان تصویروں پر بہت انگلیاں اٹھیں. کسی سادہ دل نے جذبات کے اظہار کی بات چھیڑ دی. اس پر

حنیف رامے صاحب نے تحقیر کے لہجے میں کہا:

"جذبات، جذبات کا کیا ہے وہ تو کتّوں کے بھی ہوتے ہیں۔"

میں اس دلیل کا فوراً قائل ہو گیا کیونکہ اپنی گلی کا کتّا روز مجھے دیکھ کر جذباتی ہو جاتا تھا اور سخت بھونکتا تھا۔

ویسے جرمن افسانہ نگار کافکا کی ایک کہانی کو سچ سمجھا جائے تو کتّے صرف جذباتی ہونا نہیں جانتے بلکہ فلسفیانہ غور و فکر بھی کرتے ہیں۔ پس فلسفہ، فلسفہ کا کیا ہے وہ تو کتّے بھی پڑھ ڈالتے ہیں۔

اس بحث میں کسی نے نئی شاعری کے نمائندے کے طور پر جیلانی کامران صاحب کا نام لیا۔ اس پر ایک نوجوان عارف امان نے چیخ کر کہا کہ:

"اس کا نام مت لو۔ وہ مولانا حالی کے زمانے کا شاعر ہے۔ ہم نے اسے نئی شاعری کے حلقہ سے نکال دیا ہے۔"

کسی نے چپکے سے سوال کیا کہ "مبارک احمد صاحب کے متعلق کیا خیال ہے؟"

پرانی نسل کے ایک ادیب نے کہا "جناب والا جب میں تھرڈ ایر میں تھا تو مبارک احمد صاحب کی نظمیں ذوق و شوق سے پڑھا کرتا تھا۔

اس پر نوجوان نے اطلاع دی کہ "مبارک احمد کو بھی نئی شاعری سے نکال دیا گیا ہے۔"

تب سب نے حیران ہو کر پوچھا "پھر باقی کون بچا؟"

اس پر ایک ستم ظریف نے ٹھنڈا سانس لیا اور کہا "اللہ بس باقی ہوس"

جب سب کو بُرا نا کہہ کر رَد کر دیا گیا تو ایک صاحب نے نہایت خلوص سے پوچھا

"جناب آپ میں نئی بات کیا ہے؟"

تب نوجوان دانشور نے کہا کہ "ہم نے مذہبی مابعدالطبیعات کو رد کر دیا ہے

ہماری مابعدالطبیعات بدل چکی ہے"

اس کا ایک شخص نے یوں جواب دیا کہ "مذہبی مابعدالطبیعات کو تو ۱۹۳۶ء

میں "انگارے" کے لکھنے والوں نے بھی رَد کر دیا تھا. تو آپ تو ۳۶ء کے لوگ ہوئے"

اس پر نوجوان دانشور تڑپا اور بولا "مگر وہ لوگ شاعر نہیں تھے. ہم شاعر ہیں"

مابعدالطبیعات کی اصطلاح سُن کر ایک دل لگی باز نے جھرجھری لی اور کہا:

"جنابِ صدر، ان لڑکوں کی مابعدالطبیعات نہیں بدلی. طبیعات بدلی ہے"

(۱۱ ۳/۶۴)

ناول دشمن ناول،

ادیب یورپ میں ہے۔ ادب کا موضوع مشرق میں ہے اور ادب کا قاری روس میں ہے۔ سو اب ادب کی روایت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھری ہوئی ہے۔ کم از کم فیض صاحب کی گفتگو سے یہی نتیجہ نکلتا تھا۔

گورنمنٹ کالج کی مجلسِ اقبال میں طلبا، طالبات اور باہر کے چند مہمان جمع تھے۔ اور فیض صاحب اپنے سفر کے حالات سُنا رہے تھے۔ سفر کے حالات انھیں نہ کہیئے بلکہ یوں کہیئے کہ اس سفر میں جن ادیبوں سے وہ ملے ان کی گفتگو کو انھوں نے یہاں دہرایا۔

ژاں پال سارتر، ایلیا اہرن برگ، پبلو نرودا، یہ ان ادیبوں میں سے ہیں جن سے ان کی باتیں ہوئیں۔

ناول کے بارے میں ایک مباحثہ تھا۔ ان میں یہ ادیب جمع تھے۔ اور ANTI NOVEL کی تحریک کہ فرانس میں نئی نئی شروع ہوئی ہے۔ بحث کر رہے تھے۔ اس مباحثہ میں تو جو کچھ ہوا وہ ہوا مگر نجی گفتگو میں سارتر صاحب کچھ ہارے ہوئے

نظر آتے تھے۔ کہتے تھے کہ یورپ میں فی الحال ادب پیدا ہونے کے امکانات نہیں ہیں وجہ؟ وجہ یہ ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد یورپ کے ملکوں میں کچھ سکون کی سی کیفیت ہے۔ کوئی چپقلش، کوئی آویزش پیدا ہی نہیں ہوئی اور نہ کوئی ایسی منزل نظر آتی ہے جس تک پہنچنے کے لئے جدوجہد کی جائے۔ جس کے لئے بے اطمینانی اور اضطراب کا مظاہرہ ہو۔ سو ادب کے موضوعات کہاں سے پیدا ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ یہاں ادیب سب کچھ کہہ چکے۔ مگر صدیوں کے عمل میں انھوں نے لکھنے کا ہُنر خوب سیکھا ہے۔ اس ہنر کو وہ کہاں لے جائیں۔ پس وہ اس ہُنر کو تو آزمائیں گے اور صنعت گری دکھائیں گے۔ یہ وجہ ہے کہ یہاں ANTI NOVEL قسم کی تحریکات پیدا ہو رہی ہیں۔

ادب پیدا ہونے کی گنجائش اصل میں مشرق میں ہے۔ الجزائر بھی وہیں ہے اور کانگو بھی وہیں ہے۔ جن ملکوں میں اس بڑے پیمانے پر انقلاب نہیں آئے وہاں بھی ایک آویزش تو ہے اور بڑے پیمانے پر تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اس بے اطمینانی اور آویزش کی آغوش میں ادب کے بہت سے موضوعات ہیں۔ مگر دقت یہ ہے کہ وہاں لکھنے کا ہُنر نہیں ہے۔ لکھنے کا ہنر یورپ میں ہے اور لکھنے کے لئے موضوعات مشرق میں ہیں۔

فیض صاحب کہتے تھے کہ سارتر سے ان کی بہت دیر تک گفتگو رہی۔ تب میری نظروں نے بے ساختہ قیوم نظر کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ مگر وہ نظر نہیں آئے۔ بات یہ ہے کہ قیوم صاحب بہت غلط وقت میں پیرس پہنچے تھے۔ اس وقت ہنگری کا مسئلہ گرم تھا۔ اور سارتر صاحب ادب اور فلسفہ دونوں بھولے ہوئے تھے۔ اور ہنگری

کے لئے چندہ جمع کر رہے تھے۔ قیوم صاحب نے ہنگری کے لئے چندہ نہیں دیا۔
اور سارتر صاحب شاعری میں ہیئت کے تجربوں پر بات کرنے کے روادار نہ ہوئے۔
سو ڈیڑھ منٹ میں یہ دو ادیب ملے اور جُدا ہو گئے۔

مگر قیوم صاحب چندہ بھی دے دیتے تو کیا فرق پڑتا۔ سارتر صاحب کو بات
ہنگری ہی پہ کرنی تھی۔ اور قیوم صاحب کہتے تھے کہ میں شاعر ہوں۔ سیاست سے
غرض نہیں رکھتا۔

ایلیا اہرن برگ کی باتیں بھی فیض صاحب سے سُن لیجئے۔ ہوٹل کے کمرے
میں کسی روسی مصوّر کی بنائی ہوئی تصویر آویزاں تھی۔ پوچھا گیا کہ کیسی تصویر ہے۔ جواب
ملا کہ روسی دو کام نہیں جانتے۔ کافی بنانا اور تصویر بنانا۔ پس آپ تصویر کی بات
نہ کریں۔

پھر اُنھوں نے دم لیا اور کہا کہ ویسے یہ ہوٹل کا کمرہ ہے۔ ہوٹل کے کمرے
میں ہمیشہ بُری تصویر آویزاں ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ بامذاق لوگ ہوٹلوں میں
تو نہیں ٹھہرتے۔ ادیب ہوگا تو دوست کے گھر ٹھہرے گا۔ یا کسی سرائے میں پڑاؤ
کرے گا۔ بڑے ہوٹلوں میں تو بدمذاق لوگ آکر ٹھہرتے ہیں۔

تصویر بنانا تو خیر روسی جانتے ہی نہیں۔ مگر ادب پیدا کرنا کیوں بھول گئے۔ سوال
کرنے والوں نے سوال کیا کہ دوستوفسکی، ٹالسٹائی اور چیخوف کی روایت کیا ہوئی،
حتیٰ کہ گورکی جیسا لکھنے والا بھی سوویٹ روس میں پیدا نہیں ہوا۔

جواب ملا کہ سوویٹ روس نے ادب تو پیدا نہیں کیا مگر ادب کا قاری پیدا کیا ہے۔ اور ادب کا قاری اس وقت یورپ میں نہیں روس میں ہے۔ شکسپیئر کے جتنے ایڈیشن انگلستان میں چھپے ہیں اس سے زیادہ پچھلے پانچ سالوں میں روس میں چھپے اور بکے ہیں۔

یہاں گفتگو تمام ہوئی تو شعروں کی فرمائش کی گئی۔ یہ فرمائش پوری کی گئی۔ اس میں خوشی اور اطمینان کا پہلو یہ ہے کہ فیض صاحب نے نئے شعر سنائے۔ معلوم ہوا کہ جیل کے بعد جو چیز فیض صاحب کی شاعری کو راس آتی ہے وہ سفر ہے۔

(۱۵ ۳/۴)

درخت کی شہادت

پنجاب یونیورسٹی کے سر سے اس کے بزرگ کا سایہ اُٹھ گیا ہے۔ یہاں گیٹ کے برابر مال روڈ پر ایک اُونچا گھنا درخت، بہت زمانے سے کھڑا تھا۔ اس یونیورسٹی میں بہت وائس چانسلر آئے اور چلے گئے۔ مگر یہ وائس چانسلر اپنی ایک وضع کے ساتھ قائم تھا۔ اور یونیورسٹی کی باوقار روایت کا حصّہ بنا ہُوا تھا۔ اِس ہفتے عجب اُفتاد پڑی۔ کہ سڑک کی توسیع کی فکر کرنے والوں نے اس پر آرا چلایا اور اس صاحبِ منزلت مقتول کی لاش کئی دن تک مال روڈ پر پڑی رہی۔

ایک سابق طالب علم نے مال پر چلتے چلتے اس لاش کو دیکھا اور افسوس کے ساتھ کہا کہ "میں اس کے نیچے کھڑے ہو کر اُس کا انتظار کیا کرتا تھا۔"

تب میں نے سوچا کہ اِس جوان علاقہ کے اس بوڑھے درخت سے انتظار کی کتنی یادیں اور ملنے نہ ملنے کے کتنے واقعات وابستہ ہوں گے۔ یہاں سائے میں کھڑے ہو کر کب کب کس کس نے کس کس کا انتظار کیا ہو گا۔ وہ خوشگوار اور ناخوشگوار لمحے تو گزر

گئے مگر یہ گوشہ ان کی یادوں کا امین تھا۔ درخت ہمارا حافظہ ہیں۔ یادوں کو محفوظ رکھنا ان کا مقدس فریضہ ہے۔ مگر یادیں صنعتی تہذیب کا مال نہیں ہیں۔ نئے شہروں میں ٹریفک کے مسئلہ نے یادوں کے مسئلہ پر فوقیت حاصل کر لی ہے۔ اور درخت کٹتے چلے چلے جا رہے ہیں۔

درخت اب سے پہلے بھی کٹے ہیں مگر اب سے پہلے درخت کا کٹنا ایک واقعہ ہوتا تھا۔ روایت ہے کہ حضرت زکریا نے اپنی امت کی دستبرد سے بچ کر ایک درخت کے تنے کے اندر پناہ لی۔ ان کی امت نے اس درخت پر آرا چلایا۔ اور اپنے درخت اور اپنے پیغمبر دونوں کو دو نیم کر دیا۔ مگر کہانی کی جو شہزادی درخت کے تنے میں جا کر چھپی تھی اس نے میٹھی آواز سے آرا چلانے والوں کو لبھایا اور اپنی جان کو بچایا۔ کچھ درخت پیغمبر ہوتے ہیں۔ کچھ درخت شہزادیاں ہوتے ہیں۔ مگر پیغمبروں اور شہزادیوں کا دور گزر گیا۔ اب لاہور کارپوریشن ہے اور بسیں اور موٹر کاریں اور ٹیکسیاں ہیں اور غریب شہر درخت ہیں۔

درخت کا کٹنا پہلے ایک واقعہ تھا۔ اور اس واقعہ کو کبیر نے یوں بیان کیا ہے۔

ع

بڑھئی آوت دیکھ کر ترور ڈالن لاگ
ہم کٹے تو اب کٹے پنکھیرو تو بھاگ

مگر مال روڈ کا درخت کارپوریشن والوں کو آتے دیکھتا ہے اور ساتھ کے درختوں کو خاموشی سے دیکھ کر بغیر کچھ کہے سُنے رخصت ہو جاتا ہے۔

اس شہر کا شاعر وداع ہوتے درختوں کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ پچھلے برس جب اسی مال پر انارکلی جانے والی سڑک کے موڑ پر کھڑا ہوا بزرگ درخت کارپوریشن کی زد میں آیا تھا۔ تو میں نے اس کا ذکر بیرسٹر افسانہ نگار سے کیا۔ بیرسٹر موصوف نے کہا کہ "تم ناسٹولجیا میں مبتلا ہو۔ اپنی بستی کے املی کے پیڑوں کا نوحہ کرتے کرتے لاہور کے درختوں کے بارے میں جذباتی ہونے لگے۔ مگر یہ کوئی قصبہ نہیں ہے۔ یہ نیا شہر ہے اور ہم بیسویں صدی میں رہتے ہیں۔

یہ کہہ کر بیرسٹر افسانہ نگار نے ہارن دیا۔ میں رستہ سے ہٹ گیا اور وہ ماڈل ٹاؤن روانہ ہو گیا۔ اور میں نے اطالیہ کے افسانہ نگار البرٹو موراویہ کو یاد کیا۔ اس نئے شہر روما میں ایک درخت ٹریفک کے تقاضوں کے تحت کاٹا گیا۔ تب البرٹو موراویہ نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور فریاد کی کہ کارپوریشن قاتل ہے اس نے میرے ایک زندہ ہمعصر کو شہید کیا ہے۔

درختوں کو مردہ مت کہو۔ درخت زندہ مخلوق ہیں۔ پیغمبروں، مہارشیوں، شاعروں اور شہزادیوں نے یہی جانا اور یہی کہا ہے۔

لاہور شہر میں کل تک تصوف کی روایت اور درختوں کی جڑیں گہری تھیں۔ اب یہ جڑیں ہل گئی ہیں۔ اگلے زمانے میں غریب اور ایماندار لوگ حاکموں کے ستم کو دیکھتے تھے اور کسی صوفی کے قدموں میں جا بیٹھتے تھے۔ اس شہر کے بے گھر بے در لوگ نئے تعمیری منصوبوں کو نئی نئی آباد ہوتی بستیوں کو دیکھتے ہیں اور درختوں کے قدموں میں جا

بیٹھتے ہیں۔ اور یہ گننا بہت مشکل ہے کہ اس شہر میں اس وقت کتنے درخت ہیں اور کتنے غریب غربا ان کے سائے میں بستر ڈالے پڑے یا کوئی ٹوٹی پھوٹی دوکان لگائے بیٹھے ہیں۔ شکر ہے کہ یہاں کی ہر سڑک مال روڈ نہیں ہے اور ہر سڑک کے بارے میں یہاں کی کارپوریشن اتنی متفکر نہیں ہے۔ امن میں ہیں وہ درخت جو مال روڈ پر نہیں ہیں۔ مگر ٹریفک کا مسئلہ پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے اور شہر پھیل رہا ہے اور جو سڑکیں آج وسیع نہیں وہ کل وسیع ہوں گی۔ بس درختوں پر اس شہر کی زمین تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ جو درخت کٹتا ہے وہ دوسروں سے یہ کہہ کر رخصت ہوتا ہے۔

ع آج ہم، کل تمہاری باری ہے۔

(۲۱ مارچ ۹۴)

ہوائیں تصویریں

چڑیا گھر کے ایک جنگلے کے سامنے ایک نوجوان گھٹنے پر کینوس پھیلائے بڑی یکسوئی سے نقش پھیلا رہا تھا۔ جنگلے کے اس طرف ایک بندر اسی یکسوئی سے حیرت سے آنکھیں کھولے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ شاید اس نے اس نوجوان کے مقصد کو سمجھ لیا تھا۔ اور نہایت خلوص سے اپنی پورٹریٹ کے لئے سٹنگ دے رہا تھا۔ مگر ایک تماشائی نے چلتے چلتے بندر کو دیکھ کر آنکھ ماری۔ بندر نے پلک کی جھپک کو تیجی جانا اور اچانک اُچک کر چھت میں لٹکی ہوئی رسی کو پکڑ کر الٹا لٹک گیا۔

یہ ایک دوپہر کا ذکر ہے جب مصوری کے طلبار کا ایک قافلہ چڑیا گھر میں پہنچا ہوا تھا۔ اور آرٹ کے نام پر چڑیا گھر کے جانوروں سے تعاون کا طالب تھا۔

بندر آرٹ سے بیر نہیں رکھتے بلکہ مصور تھوڑی سی نرمی کا ثبوت دے تو وہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ رنگ اور برش خود سنبھال لیں اور نہایت خلوص سے تجریدی آرٹ کا کوئی شاہکار تیار کر ڈالیں۔ مگر ان بھلے مانسوں نے طبیعت سیمابی پائی ہے اس لئے وہ جم کر سٹنگ

نہیں دے سکتے۔

ہاں جس مصور نے سارس کی تصویر بنانے کی ٹھانی تھی اسے اس قسم کی کسی پریشانی سے سابقہ نہیں پڑا صوفی منش سارس آنکھیں بند کئے چونچ پروں میں چھپائے گھنٹوں مراقبہ میں رہتے ہیں۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا۔ مصوروں اور فوٹوگرافروں کو دیکھ کر نہ تو بدکتے ہیں نہ پبلسٹی اور شہرت کی تمنا ظاہر کرتے ہیں۔

جس طرح ایک چیز آؤٹ ڈور شوٹنگ ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک چیز آؤٹ ڈور پینٹنگ ہوتی ہے۔ کبھی نیشنل کالج آف آرٹس سے کبھی یونیورسٹی آرٹ ڈیپارٹمنٹ سے طلباء کا قافلہ نکلتا ہے اور جیتے جاگتے مناظر کو موقعہ واردات پر کینوس پر منتقل کرنے کا منصوبہ بناتا ہے۔ جانور تو خیر آرٹ کی تھوڑی بہت عزت کر لیتے ہیں اور مارے باندھے مصوروں سے تعاون کرتے ہیں۔ مگر آدمیوں کو یہ یقین دلانا بہت مشکل ہوتا ہے کہ آرٹ سے آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔

یہ پچھلے سے پچھلے جاڑوں کی بات ہے۔ ایک مصورہ سیاہ برقع زیب تن کئے ٹمپل روڈ پر پہنچی، ایک فٹ پاتھ پر اس نے کینوس سے منڈھا ہوا بورڈ نصب کیا۔ رنگ اور برش سنبھالے۔ اور اس سڑک کے منظر کو کینوس پر منتقل کرنا شروع کر دیا۔

لب سڑک مصوری اور برقع کے اس ملاپ نے آتے جاتے لوگوں کو بہت حیران کیا یہ مصورہ کم و بیش ایک ہفتہ اس فٹ پاتھ پر اپنے تخلیقی کام میں مصروف رہی۔ اور پھر لوگوں کو حیران چھوڑ کر رخصت ہو گئی۔

مگر سانده کلاں والے حیران نہیں ہوئے۔ وہاں ایک مصوّر نے اپنا کھڑاگ پھیلایا تو دن بھر محلہ کی عورتیں ایک تشویش اور خوف کے ساتھ دروازوں اور دریچوں میں سے اسے جھانکتی رہیں، دن ڈھلے جب ان کے مرد گھر آئے تو انھوں نے اس عجب شخص کی مشتبہ نقل و حرکت سے انہیں مطلع کیا اور ان مردوں نے لال پیلی نظروں سے مصور کو دیکھا اور خبردار کیا کہ آج آئے تو آئے کل اس طرف کا رُخ نہ کرنا۔

ایک مصور اندرونِ شہر ایک گلی میں پہنچا۔ وہاں لڑکوں نے پہلے اسے حیران ہو کر دور دور سے دیکھا پھر قریب آئے اور سخت حیرت سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر ایک لڑکے نے چیخ ماری۔ دوسرے نے مصور کی کمر پر مکہ مارا۔ اور یہ جا وہ جا۔ پھر ان لڑکوں نے مصور پر تالیاں پیٹنی شروع کر دیں۔ اور مصور نے بادل نخواستہ اپنا ٹانڈا باندا اٹھایا اور سٹوڈیو چلا آیا۔

مگر حنیف رامے نے آؤٹ ڈور پینٹنگ کا نرالا طریقہ دریافت کیا تھا۔ وہ سڑک پر چلتے چلتے کسی منظر کو دیکھتے، چلتے چلتے انگلیاں ہوا میں لہرا کر نقش بنا دیتے۔ بہت ہوا تو کسی زیبا صورت کو دیکھ کر ٹھٹھکے، نہایت احتیاط سے انگلی سے ہوا میں تصویر بنائی اور آگے بڑھ لئے۔ کوئی منظر بہت پیچیدہ نظر آیا تو فٹ پاتھ پر درخت سے کمر لگا کر کھڑے ہو گئے کھڑے رہے ہوا میں انگلیاں چلاتے رہے اور جب تصویر تیار ہو گئی تو اطمینان سے آگے بڑھ گئے۔ حنیف رامے کی ایسی بہت سی تصویریں کچھ تجریدی کچھ غیر تجریدی مال روڈ کی فضا میں محفوظ ہیں مگر یہ کہ وہ ہمیں تمہیں نظر نہیں آتیں۔ اور شاید اب خود حنیف رامے کو بھی نظر نہیں آتیں۔

آدمی، درخت، اور جڑیں

یہ عجب اتفاق ہے کہ عین ان دنوں جب لاہور میں درخت کٹ رہے ہیں بھارت میں راجگوپال اچاریہ درختوں کے کلام کرنے کی کہانیاں سنا رہے ہیں. السٹرٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں ایک شخص کرنل جانسن کا ذکر کیا گیا ہے جو درختوں سے بہت یاری دوستی کیا کرتا تھا. اور ان سے دیر دیر تک باتیں کرتا تھا. اس کا ایک عزیز دوست کٹ گیا تو وہ بہت رویا. درخت کاٹنے والوں کا استدلال یہ تھا کہ وہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے بہت قریب ہے. اس کی پھیلتی ہوئی جڑیں اس عمارت کی بنیاد کو نقصان پہنچائیں گی. مگر کرنل جانسن یہ کہتا تھا کہ درخت اس زمین کا پرانا باسی ہے. ڈسٹرکٹ بورڈ کی عمارت جمعہ جمعہ آٹھ دن کی ہے ڈسٹرکٹ بورڈ نے آخر کیوں اس درخت کے آنگن میں دخل اندازی کی.

یہ درخت راجگوپال اچاریہ کے خواب میں آیا اس نے اچاریہ جی سے اپیل کی کہ مجھے بے خطا قتل کیا گیا ہے. آپ میرا مقدمہ لڑیں.

راجگوپال اچاریہ نے مقدمہ تو نہ لڑا مگر مظلوم کی حمایت میں ایک مراسلہ "مدراس میل" میں لکھ ڈالا۔ اس پران کے یار آشنا بہت بگڑے۔ کہ ہم ہوم رول کے لئے لڑ رہے ہیں۔ لالہ لاجپت رائے قید میں پڑے ہیں اور آپ ایک درخت کو مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔

یہ احتجاج کرنے والا ایک وکیل تھا اور وکیل مدراس میں ہو یا لاہور میں درختوں سے پرخاش رکھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ درخت اپنا مقدمہ تو لڑوانا چاہتے ہیں مگر فیس ادا نہیں کرتے۔

یہ مدراس کے ایک درخت کا ذکر تھا۔ مگر لاہور میں تو درختوں نے بولنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی پر سایہ کرنے والا درخت اکیلا تھا۔ اس نے چپ چاپ اپنا گلا کٹوایا۔ لیکن اسمبلی کے سامنے تو درختوں کا ایک پورا قبیلہ آباد تھا۔ یہ قبیلہ اس طرح تہس نہس ہوا جیسے قبائلی دور میں ایک خاندان دوسرے خاندان کو اس طرح تہہ تیغ کرتا تھا کہ اس نسل سے کوئی باقی ہی نہ رہے۔ اور درختوں کے اس کنبہ نے بھی چپ چاپ جان دے دی۔

عجیب بات یہ ہے کہ اسمبلی کے درخت بھی بولنے کی جرأت نہیں رکھتے۔

درخت دشمن لوگ تو جو کر رہے ہیں وہ کر ہی رہے ہیں مگر اس میں کچھ کمزوری درختوں کی بھی ہے۔ جس طرح مال روڈ پہ چلنے والے آدمی میں آدمیت کم ہو گئی ہے اسی طرح مال روڈ کے درخت میں درخت پن کم نظر آتا ہے۔ اس درخت کی جڑیں کچھ غائب سی ہیں۔ بس پختہ فٹ پاتھ پر گڑا ہوا سا نظر آتا ہے۔ اور درخت ہو یا آدمی اس کی جڑیں دور دور تک پھیلی نظر آنی چاہئیں۔ باوقار وہ اسی صورت میں نظر

آتا ہے۔ شیزان میں بیٹھے ہوئے آدمی اور مال کے فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے درخت دونوں کا المیہ ایک ہے کہ وہ اپنی جڑوں کا احساس نہیں دلاتے۔

درخت کی عظمت اس میں ہے کہ وہ گہرا ہو، اونچا ہو اور پھیلا ہوا ہو جڑیں اس کی پورے کرۂ ارض میں سرایت کرتی نظر آئیں۔ اور تنا قدامت کا احساس بیدار کرے اور پھیلا ہوا اتنا ہو کہ آس پاس اندھیرا منڈلاتا محسوس ہو۔

مال کے درختوں کی جڑوں کا حال آپ نے سن لیا۔ تنے کی کیفیت یہ ہے کہ اس پر تھوڑے عرصے بعد سفیدی پھیر دی جاتی ہے۔ بس تنا قدامت کا احساس کیسے پیدا کرے اور اس کی کھکھل پر بھید بھرے غار کا شک کیسے گزرے۔

آخری بات یہ ہے کہ مال کے درختوں کی شاخیں چھدری ہیں، دھوپ بے روک ٹوک تنے تک پہنچتی ہے اور جب رات ہوتی ہے تو بجلی کی روشنی تنے تک جاتی ہے۔ بس اندھیرا ان درختوں کے آس پاس نہ دن میں منڈلاتا ہے نہ رات کی گھڑی میں نازل ہوتا ہے۔ اور رات کے وقت درخت پر ظلمت کا نزول نہ ہونا قیامت ہے۔ پھر اس میں وہ پُراسراریت پیدا نہیں ہوتی کہ وہاں کسی جن دیری کے بسیرا کرنے کا گمان گزرا ہے اس واسطے سے اس درخت میں کشش بھی پیدا ہو اور اس سے ڈر بھی آئے۔ بجلی کی روشنی نے مال روڈ کے درختوں سے اُنکا اندھیرا چھین لیا۔ اس اندھیرے کیساتھ ان کا رعب اور دبدبہ رخصت ہوگیا۔ جمعرات کی کسی شام کو کوئی بچہ کوئی جوان لڑکی مال کے کسی درخت کے قریب سے گزرتی ہوئی نہیں جھجکتی۔ ایسے درختوں سے لاہور کارپوریشن والے بھی کیوں ڈریں۔

(۱۰-۳-۶۴)

مکان کی تلاش

اُستاد ولایت علی خاں نے دِلّی میں رہ پڑنے کی نیّت باندھی ہے ۔ آجکل وہ اس شہر میں مکان تلاش کر رہے ہیں۔

اِس واقعہ پر "سٹیٹسمین" کے کالم نگار نے کہ "نئی دہلی نوٹ بک" لکھتا ہے ۔ بہت خوشی کا اظہار کیا ہے اور اُردو کے بہت شاعروں کے نام گنوائے ہیں جنہوں نے اِس شہر کو رہنے کے منتخب کیا تھا ۔ مگر شاید کالم نگار موصوف کو اس کا علم نہیں کہ اِن شاعروں نے ڈیرا ڈالنے کے بعد اس شہر کو کیا پایا ۔ میر صاحب کے مکان کا عالم یہ تھا کہ دیوار پہ کوا آکر بیٹھ جاتا تھا تو دیوار ایسے ہلتی تھی جیسے میر صاحب کا زخم خوردہ دل ہلا کرتا تھا ۔ اور کوا بولتا تو سارا مکان متزلزل ہوتا تھا ۔

جس شاعر کو رہنے کے لئے مکان ڈھنگ کا مل گیا اس کے سامنے یہ سوال تھا کہ

ع ہم نے یہ مانا کہ دِلّی میں رہیں ، کھائیں گے کیا ؟

اور اس سے بھی بڑا المیہ ایک شاعر نے یوں پیش کیا کہ ؎

مہوشاں پوچھیں نہ ٹک ہجراں میں گر مر جائیے
پھر کہو اس شہرِ نا پُرساں میں کیدھر جائیے

خَیر یہ تو بعد کی منزلیں ہیں مگر اُستاد ولایت علی خاں نے تو ابھی پہلی منزل بھی طے نہیں کی۔ ابھی تو وہ مکان کی تلاش ہی میں سرگرداں ہیں۔ خدا کرے انہیں مکان مل جائے۔ کرائے پر دینے والے شاعروں اور فن کاروں کو مکان آسانی سے نہیں دیتے۔ کیونکہ اس معاملہ میں ان کی ساکھ کچھ زیادہ اچھی نہیں۔

مولانا چراغ حسن حسرت راوی ہیں کہ جب وہ کلکتہ گئے تو انھیں وہ مکان دیکھنے کی آرزو ہوئی جہاں کبھی داغ آ کر رہے تھے۔ تلاش بسیار کے بعد اس مکان کا پتہ پایا۔ دروازے پر دستک دی۔ ایک ثقہ صورت اندر سے برآمد ہوئے۔

"ارشاد ؟"

"یہ داغ ہی کا مکان ہے نا ؟"

"کون داغ ؟"

"داغ شاعر"

"داغ شاعر۔ یہاں کوئی شاعر نہیں رہتا۔" اُنھوں نے غصہ سے کہا۔ "ہم مہینے کے مہینے کرایہ ادا کرتے ہیں"

دلی، کلکتہ، لاہور۔ شہروں کی تخصیص نہیں۔ شاعر کے لئے ہر شہر شہرِ نا پُرساں ہے۔ م۔ حسن لطیفی مرحوم تقسیم کے وقت اپنی بڑی جائداد چھوڑ کر لدھیانہ سے لاہور پہنچے۔

ننھوں اور کلیمز کے قصّے تو ہم نے ان کی زبان سے بہت سنے لیکن کبھی کسی گھر میں انھیں مکین نہ دیکھا۔ ایک ادب دوست نے انھیں اپنے یہاں رہنے کی جگہ دی۔ دروازے کے آگے انھوں نے لکھ دیا:

"چاہ یوسف عرف شاطوئے لطیفی"

جب کوئی پوچھتا کہ "لطیفی صاحب، کچھ لکھا؟"

جواب دیتے کہ "رہائش کا مسئلہ بس طے ہوا چاہتا ہے۔ مکان مل جائے پھر ایک طویل نظم لکھوں گا"

مگر نہ یوسف چاہ سے نکلا نہ شاعری کا آفتاب طلوع ہوا۔

مگر لطیفی صاحب کے بعد کے آنے والے شاعروں نے زیادہ سے زیادہ عملی ہونے کا ثبوت دینے کی کوشش کی۔ دو شاعر منیر نیازی اور انجم رومانی پہلے کرائے کے مکان کی فکر میں سرگرداں رہے۔ پھر یکایک آمد ہوئی اور انھوں نے یہ خیال پیش کیا کہ ادیبوں کی ایک کالونی ہونی چاہیے۔

رائٹرز گلڈ نے اس خیال پر اس طرح داد دی جیسے غزل میں نئی زمین نکالی جائے تو اس پر داد دیتے ہیں۔ اور قتیل شفائی صاحب نے تو یہاں تک وعدہ کیا کہ رائٹرز کالونی کے ساتھ ساتھ ادیبوں کی قبروں پر کتبے لگوانے کا کام بھی رائٹرز گلڈ اپنے ذمے لے گا۔ اس پر ادیب بہت خوش ہوئے۔ بات یہ ہے کہ مکان کی تختی سے زیادہ قبر کا کتبہ ادیب کو متاثر کرتا ہے۔ وہ مرنے کے بعد جو زندہ رہنا چاہتا ہے۔

بلکہ یہ مخلوق بالعموم زندگی میں کم اور مرنے کے بعد زیادہ زندہ رہتی ہے۔

مگر اب تو یہ تجاویز اچھی خاصی باسی ہو چلی ہیں۔ منیر نیازی نے کرائے کے مکان کی تلاش رائٹرز کالونی کے تصور میں ملتوی کر دی تھی۔ اس نے مکان کی تلاش پھر سے شروع کی۔ اور آخر ایک کونہ تلاش کر لیا۔ اور انجم رومانی نے اپنے خریدے ہوئے پلاٹ پر مکان کی تعمیر کا ارادہ رائٹرز کالونی کے حسین خواب کی نذر کر دیا تھا۔ اس نے سیمنٹ اور اینٹیں خرید لی ہیں اور راج مزدوروں سے بات چیت شروع کر دی ہے

اِدھر ریجنل سیکرٹری تعیل شفائی صاحب راولپنڈی میں تو ادیبوں سے کالونی کا وعدہ کر آتے ہیں مگر لاہور کے ادیب جب ان سے یہی سوال کرتے ہیں تو جواب میں وہ اپنی نئی غزل سنا دیتے ہیں۔

بہر حال رائٹرز کالونی ہنوز شاعر کا خواب ہے یا یوں کہیئے کہ مطلع تو ہو گیا ہے مگر زمین اتنی سخت ہے کہ اس میں غزل نہیں ہو پاتی۔

(۱۱ [illegible])

ٹھنڈک کے نئے گوشے

نئی گرمیوں کے ساتھ ٹھنڈک کے چند نئے گوشے نمودار ہوئے ہیں۔ چند دفتر اور چند ریسٹوران مزید ایرکنڈیشن ہو گئے ہیں۔ تقاریب جن مقامات پر منعقد ہوا کرتی ہیں ان میں اب تک صرف پی۔ این۔ آر اڈیٹوریم ایرکنڈیشن تھا۔ اب پاکستان آرٹ کونسل کا تھیٹر ہال بھی ایرکنڈیشن ہو گیا ہے۔

ہم گرم ملک کے رہنے والوں کے لئے گرمی ایک مسئلہ ہے اور ٹھنڈک ہمارا نصب العین ہے۔ مگر یہ کہ ٹھنڈک کے لئے ہم پہلے کچھ اور جتن کرتے تھے اب اور جتن کرتے ہیں۔
ایک زمانہ تھا کہ ہم بجلی کے پنکھے تک سے آشنا نہیں تھے۔ نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ سر پہ بجلی کا پنکھا چل رہا ہے۔ جسے گھنے برگد کے سائے میں سونا نصیب ہوا وہ گویا ایرکنڈیشن کمرے میں پہنچ گیا۔
گھروں میں لوگ ٹھنڈک پیدا کرنے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتے تھے۔ کمرے میں ریت بچھایا اس پر چھڑکاؤ کیا اور لیٹ گئے۔ یا تہہ خانے جو بنائے جاتے تھے۔ پرانی

طرز کے بڑے مکانوں اور حویلیوں میں تہہ خانہ لازماً ہوتا تھا۔ گرمیوں کی دوپہریں ان تہہ خانوں میں بسر ہوتی تھیں۔ جن گھروں میں تہہ خانے نہیں تھے وہ جھالر والے چھت کے پنکھے اور خس کی ٹٹی سے کام چلاتے تھے۔ ان پنکھوں کو کھینچنے کے لیے خادمائیں رکھی جاتی تھیں۔ یا چھوٹے لڑکے ملازم رکھے جاتے تھے۔ مگر نیند عجب شے ہے آدمی کو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ تو پنکھا کھینچنے والی خادمہ پنکھا بھی کھینچتی تھی اور خراٹے بھی لیتی تھی۔ اس کے ہاتھ عجب میکانکی صفت پیدا کر لیتے تھے کہ وہ سوتی بھی تھی اور ہاتھ پنکھا کھینچتے رہتے تھے۔

پنکھا صرف ہوا پیدا کرتا تھا۔ اس ہوا میں خنکی اور مہک پیدا کرنے کا فرض خس کی ٹٹی انجام دیتی تھی۔ تو گرمی کے دن کو کچھ پنکھے کی ہوا مارتی تھی کچھ خس کی خوشبو اور کچھ پانی کے چھینٹے اسے زائل کرتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہماری گرمیاں خوشبو میں رسی بسی ہوئی تھیں کچھ قدرت انہیں خوشبو میں بساتی تھی۔ کچھ لوگ اپنے ہنر سے انہیں خوشبو میں بساتے تھے یعنی کچھ تو باغیچوں میں خوشبودار پھول کھلتے تھے۔ اور کچھ عطاروں کے شربت اور کچی مٹی کی صراحیاں اور آبخورے اور خس کی ٹٹیاں موسم کو خوشبو میں بساتی تھیں۔

مگر پھر بجلی کا پنکھا آگیا۔ جھالر والا پنکھا رخصت ہو گیا۔ مگر خس کی ٹٹی نے بجلی کے پنکھے کیساتھ بھی کسی نہ کسی حد تک گزارہ کیا۔ مگر بجلی کے پنکھے جتنے عام ہوئے خس کی ٹٹی زوال کرتی چلی گئی۔ ایر کنڈیشنگ نے خس کی ٹٹی کے تابوت میں آخری

کیبل گاڑی۔ یوں ابھی ایر کنڈیشننگ اس شہر میں عام نہیں ہے۔ لیکن محض اس کے تصور سے پہلے خس کی ٹٹی کو ہم نے فالتو قرار دے دیا ہے۔

ایر کنڈیشننگ کی ضرورت پہلے ہمارے ہاں بیجوں کو محفوظ رکھنے کے سلسلہ میں پیش آئی تھی۔ یوں سمجھیے کہ پہلے ایر کنڈیشنڈ کمرے میں آلو لگائے جاتے تھے اب آدمی لگائے جاتے ہیں۔ یہ زرعی تہذیب اور صنعتی تہذیب کا فرق ہے۔

اس شہر میں ہم نے سب سے پہلے ایر کنڈیشننگ کا لطف یو۔ ایس۔ آئی ایس کے دفتر میں بیٹھ کر اٹھایا۔ امریکی دفتر ان دنوں سینہ ٔ عاشق کی طرح ٹھنڈے تھے۔ اور پاکستانیوں کو عموماً پسند تھے

آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

اس وقت یوں لگتا تھا کہ جو عمارت ایر کنڈیشنڈ ہے وہ اپنی ذات میں چھوٹا سا امریکہ ہے۔ پاکستان کی قسمت میں یہ ٹھنڈک کہاں۔ اپنی قسمت تو یہ ہے کہ پانی کی آرزو کرتے ہیں اور آگ برستی ہے۔ لیکن دیکھتے دیکھتے یار لوگوں کی تقدیر نے پلٹا کھایا۔ پہلے ایک ریستوران ایر کنڈیشنڈ ہوا پھر دوسرا ہوا۔ پھر ریستوران ایر کنڈیشنڈ ہوتے ہی چلے گئے۔ اور حال یہ ہے جو ریستوران آج ایر کنڈیشنڈ نہیں ہے وہ کل ہو جائے گا۔ ایر کنڈیشنڈ نہیں ہوگا تو بند ہو جائے گا۔

پھر دفاتر میں ایر کنڈیشننگ ہوئی۔ اور ابھی دفاتر میں رواج عام ہوا تھا کہ کاروباریوں اور صنعت کاروں کی کوٹھیاں ایر کنڈیشنڈ ہونی شروع ہو گئیں۔ پھر خس کی

تی کو کہاں پناہ ملتی۔ سوا سے اب عہدِ رفتہ کی یادگار سمجھیے۔

اُسے کلچر کی ایئر کنڈیشنگ ہوا چاہتی ہے۔ اس کا آغاز بی این آر آڈیٹوریم سے ہوا۔ اور بی این آر آڈیٹوریم جب سے بنا ہے گرمیوں کی سہ پہر کو ہونے والی تقاریب میں برقعہ پوش خواتین کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ بی این آر والوں نے سمجھا کر انھوں نے خواتین میں قومی شعور پیدا کر دیا۔ اور میری تحقیق یہ ہے کہ گرمیوں کی دوپہر میں جو خواتین انارکلی خریداری کے لئے آتی ہیں وہ ٹھنڈک کی خوشبو لیتے لیتے بی این آر آڈیٹوریم میں پہنچتی ہیں۔ اور اکثر یوں ہوتا ہے کہ تقریب ابھی جاری ہے مگر دن ذرا ڈھلا اور جسم کو ٹھنڈک لگی اور وہ اٹھ کر یہ جا وہ جا۔

ایئر کنڈیشنگ ویسے تو خوب ہے مگر اس میں ایک آنچ کی کسر ہے۔ یعنی اس میں خوشبو نہیں۔ مگر اس میں ایئر کنڈیشنگ کی کیا خطا ہے۔ صنعتی تہذیب ہی خوشبو سے خالی ہے۔ تو اب ایئر کنڈیشنگ کی آمد آمد ہے خوشبو رخصت ہوتی ہے۔

(۱۰ جون ۶۴)

کُرتے کی نشاۃ الثانیہ

گرمیوں کے اور میووں کا ذکر تو ہو چکا مگر اُس برس جو نیا میوہ بازار میں آیا ہے۔ اس کا ذکر ابھی نہیں ہوا۔ گرمیوں کی آمد کے ساتھ جب اس پر پہلا کرتا نظر آیا تھا تو ہمارے ایک دوست نے کہا تھا کہ لو بھئی موسم بدل گیا۔

موسم واقعی بدل گیا تھا۔ کیونکہ دیکھتے دیکھتے چُست قمیصوں کا رنگ مدھم پڑ گیا۔ اور کرتے فروغ پاتے چلے گئے۔ پس ان گرمیوں میں آئس کریم اور قلفی کے ساتھ کُرتے کا لطف بھی شامل ہے۔

پچھلی گرمیوں میں موسم اور تھا۔ قمیضیں جسموں پر چپکی ہوئی تھیں اور اخلاق کے محافظ اس پر سخت جز بز تھے۔ تنگ پوشی بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھی کہ لڑکیوں کو چلنا اور بیٹھنا دشوار ہو گیا۔ اور ہم نے ایک فرشی محفل میں دیکھا کہ ایک لڑکی نے گاؤ تکیہ قریب سرکایا اور اس پر بیٹھ کر میرِ محفل سے ایک بالشت اونچی ہو گئی۔

تب محکمۂ تعلیم نے جھرجھری لی اور کالجوں کے پرنسپلوں نے تنگ پوشی کے

خلاف ہدایات جاری کیں۔ رہنماؤں نے اس کے خلاف تقریریں کیں۔ اس پس منظر میں تنگ پوشی آزادیٔ اظہار کا مسئلہ بن گئی۔ جسم اس وقت اپنا اظہار تنگ جامہ میں ہی کرنے پر مصر تھے اور آزادیٔ اظہار پر پابندی لگے تو ادیب اسے چپ چاپ قبول کر لیتے ہیں۔ مگر لڑکیاں یوں قبول نہیں کرتیں۔ پس تنگ پوشی کے خلاف زہر اگلا جاتا رہا۔ مگر تنگ پوش اس سے مطلق دل تنگ نہیں ہوئے۔

تنگ پوش دوسروں کے کہنے سننے سے کبھی دل تنگ نہیں ہوتے۔ بس خود ہی ایک لباس پہنتے پہنتے تنگ آ جاتے ہیں۔ طبیعت میں قرار جو نہیں۔ بے قرار طبیعت نئے نئے فیشن تراشتی ہے۔ اور ہر فیشن یوں آتا ہے کہ پچھلا فیشن غدر سے پہلے کا معلوم ہونے لگتا ہے اور اس مرتبہ نیا فیشن غدر سے پہلے کے فیشن کو اپنے ساتھ لے کر آیا۔

ایک زمانے میں گھر میں بیٹھنے والی معزز خواتین سوئی سے کرتے سیتی تھیں۔ گریبان کے گرد بیل کاڑھتی تھیں۔ اور بٹن عجب طرح لگائے جاتے تھے کہ پورے گریبان پر چاندی کی ایک زنجیر سی لہراتی نظر آتی تھی۔ مگر زمانے کے ساتھ یہ کرتا رخصت ہو گیا۔ اب وہ دیہات میں مروج تھا۔ شہر کی عورت اسے فراموش کر چکی تھی۔

لوکل کلچر گاؤں سے پھر شہر لوٹ آیا ہے۔ پہلے یوں ہوا کہ کسی کسی امیرزادی نے منہ کا مزا بدلنے کے لئے تنگ چوڑی دار پائجامہ اور کرتا پہنا۔ اور منفرد حیثیت اختیار کر لی۔ اس انفرادیت کو دیکھنے والیوں نے دیکھا۔ اور اس کے بعد یوں ہوا کہ

چوڑی دار پائجامہ تو کہیں پیچھے رہ گیا مگر کُرتے کا سکّہ سارے شہر میں چلتا ہے۔ اور

ع موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی،

یہی کُرتا دیہاتیوں کے جسم پر سخت فرسودہ لباس نظر آتا تھا مگر گلبرگ میں جاکر وہ سخت ماڈرن ملبوس نظر آنے لگا۔

مگر عجب بات یہ ہے کہ کرتا اگر مرد پہنے تو وہ مال روڈ کے ہوٹل میں داخل نہیں ہو سکتا۔ عورت زیب تن کرے تو شیزان کا پاسبان بچھ بچھ جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ کُرتے نے اپنے جوہر سے کوئی مقام حاصل نہیں کیا بُتوں سے نسبت پاکر شرف حاصل کیا ہے۔

کُرتا تو چالو ہو گیا۔ مگر چوڑی دار پائجامہ کی دال نہیں گلی۔ ہاں ساڑھی نے اپنا کھویا ہوا مقام پھر حاصل کر لیا ہے۔ اور اگر اس واسطے ہی سے پاکستان کی تاریخ کا جائزہ لینا ہے تو احوال یوں ہے کہ پاکستان کے آغاز کے برسوں میں غرارے کو بہت عروج ملا۔ یہ عروج اس نے بیگم لیاقت علی مرحوم سے نسبت حاصل کر کے پایا تھا مگر ع عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا۔

غرارے کی دھوپ اس آفتاب کے ساتھ چلی گئی۔

اس وقت سے اب تک شلوار قمیض بلا شرکتِ غیرے دلوں پر حکومت کرتی تھیں۔ ساڑھی نے اس شہر میں بہت برس یوں گزارے جیسے کوئی ممتاز سیاسی لیڈر سیاسی جنگ میں ہار کر گوشہ گمنامی میں چلا جائے اور واپسی کے لئے مناسب موقع

کا انتظار کرے۔ ساڑھی کی سیاست اب کامیاب ہے۔ وہ گوشۂ گمنامی سے نکل آئی ہے۔ اور اپنی تنہ در تنہ ہستی کے ساتھ کلچرل تقریبوں اور ریستورانوں اور مال روڈ کی دوکانوں پر اپنا مظاہرہ کر رہی ہے۔

بات یہ ہے کہ نسوانی ملبوسات کا عروج و زوال بھی اپنی جگہ ایک فسانۂ عبرت ہے۔ پرانے زمانے کے صوفیا سلطنتوں کے عروج و زوال کو دیکھتے تھے۔ اور زمانے کی ناپائداری اور زندگی کی بے ثباتی کا شعور حاصل کرتے تھے۔ اب ہم مشرق وسطیٰ کے سیاسی انقلابوں اور شہر لاہور کے ادلتے بدلتے نسوانی فیشنوں کو دیکھ کر یہ عرفان حاصل کرتے ہیں۔ اس شہر میں ایک نسوانی لباس کی جگہ دوسرا نسوانی لباس یکایک یوں لیتا ہے جیسے مشرق وسطیٰ میں یکایک ایک حکومت کا تختہ الٹتا ہے اور دوسری حکومت قائم ہوتی ہے۔

مگر مردوں کا احوال عجیب ہے۔ مسلمان مرد نے سر سیّد احمد خاں کے زمانے میں اپنا لباس تبدیل کیا تھا۔ اس وقت سے اب تک وہ اسی لکیر کو پیٹے جا رہا ہے۔ وہی ایک کوٹ پتلون کی جگالی ہو رہی ہے۔ بس اتنا ہوتا ہے کہ کبھی کوٹ اونچا ہوتا ہے کبھی نیچا ہوتا ہے۔ کبھی ڈبل بریسٹ ہوتا ہے اور کبھی اس کے بٹن تین ہوتے ہیں کبھی دو، اور کبھی ایک۔ اور پتلون کی موری تھوڑے دنوں چوڑی رہتی ہے۔ پھر تھوڑے دنوں تنگ رہتی ہے۔

اللہ نے لاہور شہر کی خواتین کو جو تنوع پسند اور ایجاد خیز طبیعت

عطا کی ہے اس سے یہاں کے مرد یکسر محروم ہیں۔ یوں تو ان دونوں گروہوں نے دوش بدوش تنگ پوشی شروع کی تھی۔ مگر اس تھوڑے سے عرصے میں خواتین نے ملبوسات کے گلشن میں روز ایک نیا گل کھلایا۔ مگر قدامت پسند ٹیڈی نوجوان اسی تنگ پتلون کی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔

(۲ ۶/۹۴)

موتیا کی آخری لڑائی

گذشتہ اتوار کو حلقۂ اربابِ ذوق میں کشور ناہید اپنی نئی غزل سُنا رہی تھیں۔ یوں شاعری کی بھی اپنی خوشبو ہوتی ہے مگر اس معاملہ میں میری قوتِ شامہ ضعیف ہے۔ تو مجھے جو اپنی قوتِ شامہ پر شک ہُوا وہ شاعرہ کے جوڑے میں بندھے ہوئے پھول دیکھ کر پیدا ہُوا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے استفسار کیا تو جواب ملا کہ

"یہ تو پلاسٹک کے پھول ہیں۔"

یہ سُن کر میں حلقۂ اربابِ ذوق سے نکلا اور لپک جھپک ریگل چوک کی طرف چلا۔ اصل میں اب مجھے ایک اور شک نے آگھیرا تھا۔ اس شک نے کہ روز شام پڑے جو میں اس علاقہ میں پھولوں کے ہار بکتے دیکھتا ہوں وہ بھی تو پلاسٹک کے نہیں ہوتے۔ ریگل چوک پر جا کر ایک ہار خریدا۔ پھولوں کو چھو کر دیکھا۔ پھر سونگھا۔ وہ شاداب بھی تھے اور مہک بھی رہے تھے۔ تب جان میں جان آئی۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی اس شہر میں تازہ پھول موجود ہیں۔ یہ آج کی بات ہے۔ کل کا کچھ پتہ نہیں کہ شاداب مہکتے پھول غائب

ہو جائیں اور پلاسٹک کے پھولوں کے گجرے یہاں فروخت ہوتے نظر آئیں

یہ تھا آنے والے کل کا اندیشہ تھا۔ گذرے ہوئے کل کی کہانی یہ ہے کہ پھول ہماری زندگی میں بہت رچے بسے تھے۔ یوں کیاریوں میں رنگا رنگ پھول کھلتے لیکن گرمیوں کی رونق اجلے پھولوں سے تھی۔ بیلا، چنبیلی، چمپا، موتیا، نواڑا، مولسری، جوہی، ہارسنگھار وغیرہ وغیرہ۔ ان میں ہارسنگھار وہ پھول ہے کہ پتیاں سفید مگر جڑ زعفران رنگ ہوتی ہے۔ ایک زمانے میں ان جڑوں کو جمع کر کے ان سے دوپٹے رنگے جایا کرتے تھے۔ بیلا اور موتیا نے کچھ گجروں اور ہاروں کے واسطے سے مقبولیت حاصل کی۔ کچھ بالیوں اور جوڑوں میں بندھ کر نگاہوں میں چڑھے اور کچھ صراحیوں اور کورے گھڑوں پہ سج کر نظر نواز ہوئے۔

گھڑے اور صراحیاں متروک ہوتی جا رہی ہیں اور ریفریجریٹر پہ پھول سجانے کی کوئی تک نظر نہیں آتی۔

موتیا باقیات الصالحات میں سے ہے کہ اب تک مال پر نظر آتا ہے۔ باقی پھول غائب ہو گئے۔ وہ باغ جناح کی کسی کیاری میں پھولتے دکھائی نہیں دیں گے۔ ان سے تعارف حاصل کرنے کے لئے آپ مثنوی سحر البیان اور گلزار نسیم پڑھیں۔ مگر کسی تہذیب کے لئے یہ کوئی نیک شگون تو نہیں ہے کہ اس کے پھول زندگی سے غائب ہو جائیں اور بس شاعری میں باقی رہ جائیں۔ ویسے شاعری کا معاملہ بھی یہ ہے کہ غزل والوں نے پھول کو پھول رہنے ہی نہ دیا۔ اسے استعارہ بنا دیا۔

مگر موتیا کا پھول ابھی استعارے کی قبر میں دفن نہیں ہوا ہے۔ اندرونِ شہر کے بعض بازاروں میں تو خیر اس کا بہت رواج ہے۔ مگر وہ مال پر بھی مہکتا ہے۔ ویسے اس مہک میں اچھا خاصا فرق آ گیا ہے۔ ابھی ایک دو برس تک مال پر جا بجا پھولوں کے ہار والے شام سے نکلتے تھے اور رات گئے۔   گھومتے رہتے تھے۔ جب بازار بند ہو جاتے اور مال خاموش ہوئی اور رات بھیگنے لگتی تو پھول بیچنے والوں کی بدولت مال کے مختلف گوشوں سے خوشبو کی لپٹیں اٹھتیں۔

اب موتیا کا بازار مندا ہے۔ پھول والے تھوڑے رہ گئے ہیں۔ ان کا اڈہ اب شیزان کے سامنے کا قطعہ ہے۔ اس مختصر سے برگزیدہ قطعہ میں گھوم پھر کر وہ اپنے ہار بیچ لیتے ہیں۔ مگر جب شیزان بند ہوتا ہے اور رات بھیگنے لگتی ہے تو یہ پھول والے بھی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اب مال پر رات بھیگتی تو ہے مگر مہکتی نہیں۔

تہذیبیں اپنے پھولوں سے پہچانی جاتی ہیں مگر پاکستان کی نئی تہذیب انگریزی پھولوں سے پہچانی جاتی ہے۔ اجلے مہکتے پھول ہوا اور مٹی کے ایک مخصوص رنگ انسانوں کے ایک مخصوص مزاج کے نمائندے ہیں۔ اب یہ سب پھول مرجھا چکے ہیں اور چنبیلی جسے قومی پھول قرار دیا گیا تھا ہمارے درمیان سے یوں گم ہے جیسے قومی شعور گم ہوا۔ اب بے خوشبو رنگ برنگے انگریزی پھول نئے شہر کیلئے لاہور کی بہار ہیں اور جناح باغ میں دیسی پھولوں کے سوا باقی سب پھولوں کو پھوٹنے کی اجازت ہے۔ سو اب میر کی یہ نصیحت ہمارے لئے بے معنی ہوئی کہ ؎

جوں غنچہ میر اتنے نہ بیٹھے رہا کرو   گل پھول دیکھنے کو بھی ٹک اٹھ چلا کرو

موتیا اب اکیلا ہے اور شیزان کے باہر مال پر آخری لڑائی لڑ رہا ہے۔   (١٩٦٩ء)

کرتے کا داخلہ منع ہے

کرتے کی واپسی کا تذکرہ قلم بند ہو چکا. اب میں اس میں کھلی پھندنے ٹانکتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ کراچی سے آنے والے ایک کرم فرما نے اس تذکرہ پر اعتراض کیا ہے کہ لاہو محض خوشہ چیں ہے. کرتے کے مسیحا تو کراچی کے لوگ ہیں لیکن اگر خوشہ چینی بھی کی تھی تو پورے طریقہ سے کی جاتی. کراچی میں کرتا اپنی پوری روایت کے ساتھ واپس آیا ہے. یعنی اس کے ساتھ روایتی زیور بھی پہنے جاتے ہیں. روایتی زیوروں کا پورا سیٹ سو روپے میں بازار سے ملتا ہے. اس میں جگنو، پہنچیاں، کڑے اور پازیب شامل ہیں. لاہور نے کرتے کا رنگ چرایا، مگر ادھورا. یہاں کرتا تو ہے مگر اس کی ٹیم ٹام نہیں ہے.

لاہور اور کراچی کی یہ رقابت دیرینہ ہے. واقعہ یوں ہے کہ کچھ فیشن کراچی سے لاہو آتے ہیں اور کچھ فیشن لاہور سے کراچی جاتے ہیں. تقسیم اس کی یوں ہے کہ ادب اور آرٹ کے فیشن لاہور میں شروع ہوتے ہیں اور کراچی پہنچتے ہیں. ملبوسات کے فیشن کراچی میں شروع ہوتے ہیں اور لاہور آتے ہیں. لاہور میں ناصر کاظمی نے رنگ میر میں غزل لکھی

اور کراچی میں لڑکیوں نے بطرزِ عہدِ میر پہلے تنگ پوشی اختیار کی۔ پھر کرتا پہنا۔ ناصر کاظمی کی غزل کچھ چلی کچھ نہ چلی۔ مگر رنگِ میر کے موخر الذکر دو توں اسلوب کراچی سے لاہور تک خوب چلے۔

خیر یہ تو اچھی بات ہے کہ کراچی میں کرتا زیوروں کی روایت کے ساتھ طلوع ہوا مگر روایت کو کچھ بہت زیادہ مختصر کر دیا گیا ہے۔ اختصار کی اس کوشش میں اس زیور کو بھی حذف کر دیا گیا جس کا کرتے سے گہرا تعلق ہے۔ دیہاتی عورت جب کرتا پہنتی ہے تو حمائل بھی پہنتی ہے۔ یہ گلے کا ہار ہے جس میں چاندی یا رانگ کے بنے ہوئے روپے اور اشرفیاں پروئی جاتی ہیں۔

کرتا زنانہ ہو یا مردانہ، زیب دیتا ہے۔ اسے جس قدر اچھا کہیے۔ ایک زمانے میں بانکے سجیلے مرد چکن کا کرتا پہنتے تھے۔ جو لوگ سادگی کو متانت کا زیور جانتے تھے وہ وائل اور ململ کے کرتے پہنتے تھے۔ ندرت دکھانے والوں نے اس سیدھے سچے لباس میں بھی ندرت دکھائی۔ دلّی کے حکیم بھورے میاں جو کرتا پہنتے تھے وہ سلائی کا شرمندۂ احسان کبھی نہ ہوا۔ ان کے کرتے میں سوئی کبھی نہیں لگتی تھی۔ جن مقامات پر سلائی ہونی چاہیے وہاں تار سے تار ملا کر بنائی کر دی جاتی تھی۔

حکیم بھورے میاں نے چکن کا کرتا پہنا تو اس میں بھی ایک اپنا رنگ پیدا کیا۔ اُن کے کرتے کی چکن پر پھولوں کی بجائے ان کے نام کا مونوگرام کڑھا ہوتا تھا۔

کانگریس کی تحریک کے ساتھ کھدر کو عزت حاصل ہوئی۔ تب چکن، وائل۔

اور ململ کے کرتے تکلفات گردانے گئے۔ اور کھدّر کا کُرتا قومی شعور کا مظہر ہوا کانگریس سے کمیونسٹ پارٹی نے یہ کُرتا مستعار لیا اور اسے بنگالی طرز میں ڈھال کر دانشوری کی مہر لگا دی۔ ایک زمانے میں دانشور بنگالی طرز کے کھدر کے کُرتے اور عینک اور بڑھی ہوئی حجامت سے پہچانے جاتے تھے۔

کھدّر کا کُرتا بھارت میں اب بھی عام ہے۔ وہ ان کے قومی شعور کے ساتھ ساتھ ان کی سادگی پسندی کا بھی مظہر ہے پاکستان میں معاشرت عجب طرح بدل رہی ہے کہ سادہ لباس اچھا خاصا ایک عَیب بن گیا ہے اور کُرتے کی یہ اوقات ہے کہ مال روڈ کے ریستورانوں میں اس کا داخلہ ممنوع ہے۔ اب کوئی شریف آدمی کبھی کبھی جھرجھری لیتا ہے اور غل مچاتا ہے کہ یادو مَیلے کچیلے نیکروں اور جانگیوں والے مغربی سیّاح تو دندناتے بڑے سے بڑے ریستوران میں داخل ہوتے ہیں، ہم اُجلا کُرتا پہن کر آئیں تو پاسبان ٹوکتا ہے۔ مگر ریستوران والوں کے کان پر جُوں نہیں رینگتی۔ اور اس شہر میں کسی کی قومی غیرت نہیں جاگتی کہ ان منتظمین سے پوچھا جائے کہ ایک لباس کیوں ممنوع ہُوا اور دوسرا لباس کیوں باعثِ عزّت ٹھہرا۔

(۸ ۶/ ۶۴)

رنگوں کی تہذیب

کُرتوں اور کوکاکولا کی دوکانوں کو دیکھ کر میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہُوا ہے کہ آخر لاہور کا رنگ کیا ہے ؟

شہروں کے اپنے اپنے رنگ ہوتے ہیں. مثلاً ملتان کا رنگ نیلا ہے. رہائشی مکانوں سے لے کر اولیاء کے مزاروں تک نیلے ٹائل، نیلے گنبدوں پر بیٹھے ہوئے نیلے کبوتر، اُن کے اُوپر پھیلا ہُوا نیلا آسمان. اِن سب نے مل کر اس شہر کو نیلی رنگت عطا کی ہے.

مگر لاہور کا رنگ کیا ہے. اس شہر میں اچانک کوکا کولا کے سٹال قطار در قطار کھلتے چلے گئے. یہ سٹال سُرخ رنگ کے ہیں. یہاں کے اکثر ریستورانوں میں کرسیاں اور صوفے سُرخ رنگ کے ہیں. سُرخ آگ کا رنگ ہے. پس ہر چند کہ ریستوراں اب ایئر کنڈیشنڈ ہو گئے مگر آنکھوں کو یہاں آسودگی نہیں ہر طرف سُرخ رنگ دہکتا نظر آتا ہے

خوش پوشوں کے لباس بھی اس موسم میں طرفہ قسم ہیں. دھیمے رنگ تو یوں لگتا ہے کہ اس شہر سے رخصت ہو گئے. کل تک گہرے رنگوں والی قمیضیں عام

تھیں۔ اب کُرتا آیا ہے تو شوخ اور بھڑکیلے رنگوں کی ایک بارات ساتھ لے کر آیا ہے۔ کوئی اُودا ہے تو کوئی طوطے کے پروں کی طرح ہرا۔ اور ع

دو چار گلابی ہیں تو دو چار بسنتی

جوگیا کُرتا بھی ہے مگر کم کم۔ اور سفید کُرتا خال خال۔

بعض نئے مصوّروں کا دعویٰ ہے کہ خوش پوشوں اور ریستورانوں نے ڈیزائن اور PATTERN کے معاملہ میں ان کی مصوری سے بہت اثرات قبول کئے ہیں۔ مجھے اندیشہ یہ ہے کہ رنگوں کے معاملہ میں بھی انہیں کے اثرات کام نہ کر رہے ہوں۔ ان مصوروں کے ساتھ ایک اصطلاح COLOUR - SENSE کی آئی ہے۔ اور اس اصطلاح کی آمد عجیب طرح ہوئی کہ رنگوں کا شعور ہمارے نئے معاشرہ سے رخصت ہو گیا۔

بھڑکیلے رنگ ایک زمانے میں ہماری تہذیب میں متانت اور شائستگی کے خلاف سمجھے جاتے تھے۔ صرف مخصوص موقعوں پر مثلاً بیاہ شادی میں رنگ کھل کر اپنا مظاہرہ کرتے۔

بات یہ ہے کہ صدیوں تک ہم نے اپنے جذبات کے ساتھ جو سلوک کیا اور ان کی جس طرح تہذیب کی اس کے زیر اثر ہم نے رنگوں کے متعلق ایک رویہ اختیار کیا۔ ہلکے اور دھیمے رنگ جذبات کی ایک مخصوص تہذیب کے مظہر تھے اس تہذیب میں جذبوں اور رنگوں کو کھل کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔

جذبوں اور رنگوں کو کھل کھیلنے کی اجازت نہ ملی تو انھیں سمجھنے اور سلیقہ سے استعمال کے اسلوب وضع ہوئے۔ بھڑکیلے رنگ خام مال ہیں۔ اس خام مال کو سانچوں میں ڈھالنے اور انھیں بامعنی بنانے کی کوششیں ہوئیں۔ جذبات کے ساتھ موسم کا اور موسم کے ساتھ رنگوں کا رشتہ دریافت کیا گیا۔ کسی موسم میں جذبات کیا صورت پکڑتے ہیں اور کون سے رنگ کیا کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ دیکھا گیا کہ دن اور رات کے مختلف اوقات میں کونسا رنگ کس وقت کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اور لباس کے معاملہ میں یہ غور کرنا بھی لازم سمجھا گیا کہ چہرے کی رنگت کیا ہے اور کس رنگ کے ساتھ کس رنگ کا کپڑا میل کھاتا ہے۔

وقت، چہرے کی رنگت، لباس کا رنگ یہ سب مل کر ایک آہنگ بنتے تھے۔ ایک وحدت کی صورت اختیار کرتے تھے۔

لباسوں کے نئے فیشن میں یہ آہنگ بگڑ چکا ہے۔ اب موسم، وقت، چہرے کی رنگت اور لباس کا رنگ مل کر کوئی وحدت نہیں بنتے۔ اس لئے نہ رنگ کا موثر اظہار ہوتا ہے نہ جسم اپنے اظہار میں کامیاب ہیں۔ موسم کچھ اور کہانی سناتے ہیں، رنگ کچھ اور بتاتے ہیں، چہرے کی رنگت کچھ اور کہتی ہے۔

یہ جون کا مہینہ ہے اور بسنتی کرتے نے بار بار مجھے شک میں ڈالا کہ کہیں یہ فروری کا مہینہ تو نہیں۔ جب کھیتوں میں سرسوں پھول رہی تھی تو شہر میں عنابی قمیضیں بہار دکھا رہی تھیں۔ اب سرسوں ویران ہے تو لاہور میں کرتوں کی بسنت آئی ہوئی ہے۔

اِن رُتوں کے راستے ان دنوں کچھ وہ رنگ جلوہ دکھا رہے ہیں جن کا جلوہ برسات میں نظر آتا ہے اور کچھ وہ رنگ پھول رہے ہیں، جو گرمیوں میں بھلے لگتے ہیں۔

رنگوں کی اس تہذیب کو کچھ زندگی کے بے معنی ہونے سے صدمہ پہنچا۔ کچھ اسے امریکی اثرات نے تباہ کیا۔ اجتماعی تحریکوں کے زمانوں میں جذباتی زندگی کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے۔ کچھ اور مقاصد توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔ سو ان دنوں زندگی کے اور طریقوں کے ساتھ ساتھ لباس بھی سادگی کا رنگ لے لیتے ہیں۔ اور رنگ تیز سے دھیمے ہو جاتے ہیں۔

مگر جب کوئی بڑا مقصد سامنے ہی نہ ہو اور زندگی بے رنگ نظر آئے تو پھر شوخ رنگوں سے اس میں رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اور امریکہ کی تو تہذیب ہی کا لہجہ تیز اور رنگ بھڑکیلا ہے۔ وہاں سے رنگ چرانے والوں نے یہاں کی تہذیب کے ساتھ ساتھ موسمی تہذیب کو بھی فراموش کیا اور موسم بے موسم تیز رنگوں کو اچھالا۔

(۲۷/۶/۹۴)

سائیکل والی رخصت ہوگئی

اطلاعاً عرض ہے کہ سائیکل والی لڑکی اس شہر سے جا چکی ہے اور اس شہر میں سائیکل والی کا آنا بھی ایک واقعہ تھا اور چلے جانا بھی ایک واقعہ ہے۔

آزادی کے بعد اس شہر میں عورت نے اپنی آزادی کا پہلا اعلان سائیکل پر بیٹھ کر کیا۔ اس اعلان نے اپنا اثر کیا۔ اور چند برس نسوانی سائیکلیں مال روڈ پر اور کالجوں کے نواح میں خوب رواں دواں رہیں۔

سائیکل تیز رفتار سواری ہے۔ مگر نسوانی طبیعت نے اس سے زیادہ تیزی دکھائی۔ لباس ہو یا سواری، ایک وضع پر قائم رہنا نسوانی وضعداری کے خلاف ہے۔ سائیکل دیکھتے دیکھتے آؤٹ آف ڈیٹ ہوگئی۔

سائیکل سے موٹر کار کی سمت زقند لگائی گئی۔ مگر اس زقند میں نسوانی آزادی سلب ہوگئی۔ سائیکل نسوانی خود مختاری کا اعلان تھی۔ مگر کار میں اختیار مرد کا ہوتا ہے۔ عورت بالعموم بس ہمنشیں ہوتی ہے۔ یوں بعض خواتین بلا شرکت غیرے کار چلاتی

ہوئی دیکھی جاسکتی ہیں۔ مگر انھیں مستثنیات جانیے نمائندہ رجحان کی حیثیت وہ نہیں رکھتیں۔

ھگو شہر میں کاریں کم تھیں اور لڑکیاں زیادہ تھیں۔ اور کاریں یوں دیکھتے دیکھتے بہت ہوگئیں مگر پھر لڑکیاں ان سے بھی زیادہ ہوگئیں۔ تب پردۂ غیب سے سکوٹر نمودار ہوا۔ سائیکل سے اُتری ہوئی جو لڑکیاں کار میں جگہ نہیں پا سکی تھیں وہ سکوٹر پر سوار ہوگئیں۔ مگر سکوٹر کا بندوبست بھی وہی کاروالا رہا۔ یعنی چلانے والے مرد اور پیچھے بیٹھنے والی عورت۔ یوں اس سواری میں کاروالا وقار نہیں۔ مگر فریقین نے تجربے کے بعد اس سواری کو زیادہ موافقِ مطلب پایا۔ لاہور کے سکوٹر کی ایک نفسیات یہ ہے کہ پیچھے کوئی خاتون بیٹھی ہو تو وہ زیادہ تیز چلتا ہے۔ اس صورت میں تیز رفتاری کے اپنے فوائد ہیں۔

موٹر اور سکوٹر میں عورت ہنوز مرد کی ترخ ہے۔ مگر زمانہ ایک وضع پر قائم نہیں رہتا اور نسوانی دنیا میں زمانہ زیادہ تیزی سے بدلتا ہے۔ پہلے اِکّا دُکّا عورت موٹر چلاتی نظر آتی تھی مگر پچھلے چند ماہ میں موٹروں کی باگ ڈور اچھی خاصی عورتوں کے ہاتھ میں آگئی ہے۔

سکوٹر بظاہر خالص مردانہ سواری ہے۔ اسے چلانا اور پھر لاہور کی سڑکوں پر چلانا جہاں نیا ٹریفک ہنوز افراتفری کا شکار ہے، مردانہ ہمت چاہتا ہے۔ مگر نئی عورت یہ مردانگی دکھانے پر تُلی ہوئی ہے۔ تو مال روڈ پر عورت سکوٹر چلاتی ہوئی

بھی نظر آنے لگی ہے۔

یعنی سائیکل والی خود مختاری واپس آ رہی ہے۔

نسوانی طبیعت ایک وضع پہ قائم رہنے کی قائل نہیں۔ اب شاید اس کا جی نسائیت سے بھی بھر گیا ہے۔ نئی عورت کا جی مرد بننے کو چاہتا ہے۔ یوں مرد بننا بھی تھوڑے دن کا نقش ہے۔ عورت کو آخر اپنے مقام پر واپس آنا ہے مگر یہ بعد کی بات ہے۔ اس وقت اس کے تیور مرد بننے کے ہیں۔ سواری اور لباس دونوں اس کی غمازی کرتے ہیں۔

کرتے کی نشاۃ الثانیہ بہت مبارک اقدام تھی مگر جس کرتے نے فروغ پایا وہ مردانہ کرتا تھا۔ اور ہم جیسے لوگوں نے اس جیص بیص میں موسم گزار دیا کہ ہمارا کرتا تو دوسرے جسم پر سج گیا، ہم کیا پہنیں۔

اب مردانہ قمیص کو چار چاند لگے ہیں۔ مردانہ قمیص اب جا بجا نسوانی جسموں پر آراستہ نظر آتی ہے۔ یہ عالم دیکھ کر ایک تن جلے نے کہا کہ "یارو! کرتے کو تو ہم نے صبر کر لیا تھا مگر اب ہماری قمیص بھی گئی۔"

اس قمیص کی رعایت سے اب کسی کسی جسم پر پتلون بھی نظر آنے لگی ہے۔ سائیکل کے وقت میں ڈھیلی ڈھالی نسوانی قمیص رائج تھی۔ جو نیچی ہوتے ہوتے گھٹنوں کو چھو گئی تھی۔ سائیکل سے کار اور کار سے سکوٹر پر منتقل ہوتے ہوتے پہلے چست قمیص آئی پھر کرتے نے رواج پایا۔ اب جب عورت سکوٹر خود چلانے پر

مائل ہے تو اس رعایت سے مردانہ قمیص آیا چاہتی ہے۔

ڈیڑھ بات دوپٹے کے متعلق۔ وہ دوپٹہ جو گھر میں رنگ کر اور چن کر اوڑھا جاتا تھا اب متروک ہے۔ چنا ہوا دوپٹہ سر اور سینے کو ڈھانپتا تھا۔ جب یہ دوپٹہ غائب ہوا اور پٹی کی صورت والا دوپٹہ آیا تو سر کو ڈھکنے کا تصور غائب ہو گیا۔ اب دوپٹہ کیسا بھی ہو وہ سر پر نہیں سجتا۔ سر پر دوپٹہ سجانے کی روایت فراموش تو نہیں ہوئی ہے مگر اس کی تھوڑی تخصیص ہو گئی ہے۔ بی این آر آڈیٹوریم میں یوم اقبال کی تقریب تھی۔ آغاز تلاوتِ قرآن سے ہوا۔ اور تلاوت کے ساتھ ایک دوپٹہ آہستگی سے کاندھے سے سر پر چلا گیا۔ جب تلاوت ختم ہوئی تو اسی آہستگی سے وہ سر سے کاندھوں پر ڈھلک آیا۔

اب دوپٹہ اذان کی آواز اور قرأت کے ساتھ سر پر سجتا ہے اور باقی اوقات میں وہ سر پر بار نہیں بنتا۔ کاندھوں کی زینت ہوتا ہے۔

(۲۷ مئی ۸۴ء)

بڑی عمارت اور چھوٹا آدمی

آدمی نہ آدم زاد۔ عمارتیں سنسان ویران۔ سڑکیں ہُوحق کرتی تھیں۔ اور ہم نے سوچا کہ یا اللہ اس بھرے شہر میں جہاں آدمی پر آدمی گرتا ہے اور رہنے کو مکان مشکل سے ملتا ہے۔ یہ خالی گوشہ کیونکر نمودار ہوا۔ ابھی ہم خدا کی اس قدرت پر حیران ہوئے تھے کہ برابر سے ایک کار زنّ سے گذری اور قریب ہی ایک کوٹھی میں مڑ گئی۔ مگر پھر وہ کار گم ہو گئی۔ اور سڑک پھر اسی طرح سنسان تھی۔ پھر خانساماں کی صورت ایک آدمی سائیکل پر سوار ایک کوٹھی سے نمودار ہوا اور تیزی سے گذر گیا۔ اب ہم مزید حیران ہوئے کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ کہ یہ سب کوٹھیاں خالی ڈھنڈار نظر آتی ہیں۔ مگر کبھی کوئی کار ان میں داخل ہوتی ہے اور کھو جاتی ہے۔ کبھی کوئی آدمی پُراسرار انداز میں نکلتا ہے اور سوں سے چلا جاتا ہے۔

یہ اس بستی کا ذکر ہے جسے جی، او، آر کہتے ہیں۔ یوں افسری کی طرح جی، او، آر کے بھی مدارج ہیں۔ مگر یہ اس بستی کا ذکر ہے جو مال روڈ کے عقب میں باغ جناح

کے آس پاس سے شروع ہوتی ہے۔

لاہور شہر، گلی کوچوں کا شہر ہے اور گلیاں کوچے یہاں اس طرح سانس لیتے ہیں جیسے آدمی سانس لیتا ہے۔ یہاں اونچے اونچے دو منزلہ سہ منزلہ مکان ہیں۔ اس کے باوجود یہاں آدمی عمارت پر غالب ہے۔

جی، او، آر کے علاقہ میں عمارت آدمی پہ غالب ہے۔ پرانا شہر ہنستے بولتے آدمیوں سے بھرے پرے کوچوں سے عبارت ہے۔ جی، او، آر سمینٹ اور چونے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آدمی یہاں اپنے سارے سرکاری ٹھاٹ باٹھ کے باوجود بہت چھوٹا نظر آتا ہے۔ مگر یہ اُس وقت کی بات ہے جب وہ نظر آئے۔ اس علاقہ میں آدمی بالعموم نظر نہیں آتا۔ کار نظر آتی ہے یا سائیکل سوار خانساماں نظر آتا ہے۔

گھر کے آباد ہونے کی نشانیاں تین ہیں۔ باورچی خانہ سے دھواں اُٹھے۔ گھر کے بھیتر باہر کپڑے سوکھ رہے ہوں۔ باہر کے برآمدے میں یا دروازے کے آس پاس بچے کھیل رہے ہوں اور لڑ رہے ہوں۔ جی، او، آر کے علاقہ میں ان تینوں نشانیوں میں سے کوئی نشانی نظر نہیں آتی۔ باورچی خانوں میں سے دھواں کیونکر اُٹھے کہ بجلی کے چولھے جل گئے۔ اور باورچی خانوں کی ساخت بدل گئی۔ اور کپڑے ان گھروں میں دھوئے بھی جاتے ہیں تو وہ اس طرح نہیں سکھائے جاتے کہ آتے جاتے لوگ انھیں دیکھیں۔

مگر سب سے تعجب خیز بات یہ ہے کہ یہاں بچے کسی صورت نظر نہیں آتے۔

نہ کھیلتے ہوئے نہ لڑتے ہوئے، نہ روتے بسورتے ہوئے۔ اور وہ سڑکوں پر دکھائی نہ دیں تو باہر کے برآمدوں میں کبھی شور مچاتے نظر آنے چاہئیں۔ بات یہ ہے کہ یہاں بچّوں کے باہر آنے اور اپنے وجود کا اعلان کرنے کی تقریب کوئی نہیں۔ یہاں کسی سڑک پر نہ تو کوئی ملائی کی برف کی آواز لگاتا نظر آتا ہے نہ کوئی دہی بڑے والا، نہ چورن بیچنے والا۔

پھر کھیل تماشوں سے بھی یہ علاقہ ناآشنا ہے۔ جس طرح یہاں کوئی پھیری والا نظر نہیں آتا اسی طرح یہاں کوئی کھیل تماشے والا بھی دکھائی نہیں دیتا۔ نہ یہاں کبھی کسی نکڑ پر کوئی سانپ والا بین بجاتا اور سانپ دکھاتا نظر آئے گا۔ نہ کوئی مداری پٹاری سے کبوتر نکال کر بچوں کو حیران کرتا دکھائی دے گا۔

چھوٹ اس علاقہ کے بچّوں کی تقدیر میں نہیں ہے۔ جب یہاں کوئی بچّہ ریڈیو سنتے سنتے بور ہو جاتا ہے تو وہ ٹیلی فون کرتا ہے:

"ہیلو، میں پپّو بول رہا ہوں۔"

ادھر سے آواز آتی ہے۔ "میں منّی کی ممی بول رہی ہوں۔"

پپّو صاحب کہتے ہیں "آنٹی، منی کو بھیج دیجئے۔ ہم کھیلیں گے۔"

بچّے ٹیلی فون کے ذریعے بچّوں سے وقت مقرر کرتے ہیں۔ مقررہ اوقات میں وہ آپس میں کھیلتے ہیں۔ مگر اس طرح کہ کسی بچّے کے کپڑے خراب نہیں ہوتے۔ کپڑے خراب کیسے ہوں وہ زمین میں کھیلتے ہی نہیں۔ اس دیس کے بچّے صدیوں سے

مٹی میں لوٹتے پوٹتے چلے آرہے ہیں جنھ بوڑھی عورتیں اس کی حکمت یہ بتایا کرتی تھیں کہ مٹی سے بچّہ کا جسم فربہ ہوتا ہے۔ مگر جی، او، آر کے علاقہ میں مٹی کہیں نہیں ہے۔

محلّہ کی گلیوں اور سڑکوں کو زندہ و تابندہ رکھنے کی ضامن وہ چھوٹی موٹی دوکانیں بھی ہوا کرتی ہیں، جو رہائشی مکانات کے آس پاس قائم ہو جاتی ہیں۔ کوئی پنواڑی کوئی نون تیل والا، کوئی دودھ دہی کی دوکان۔ یہ دوکانیں گرمیوں کی دوپہروں میں شجرِ سایہ دار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ راتوں کو یہاں رت جگے ہوتے ہیں۔ اس رتجگے میں محلہ سوتا بھی ہے اور جاگتا بھی ہے

اصل میں ہمارے روایتی شہروں کی ترکیب یہ ہے کہ رہائشی مکان اور چھوٹی دوکانیں مل کر ایک وحدت قائم کریں۔ سرکاری افسر اس وحدت کے قائل نہیں ہیں۔ سو جی، او، آر میں کسی نکڑ پر کوئی دوکان نہیں ہے۔ سب دوکانیں ایک کونے میں آباد ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ انھیں ایک خانہ بنا کر ٹھونس دیا گیا ہے اور اس خانے کی پیشانی پر لکھ دیا گیا ہے۔ جی، او، آر مارکیٹ۔

انسانی بستی کا یہ ایسا نقشہ ہے جس کا تصوّر ہی ایک جیتے جاگتے صحت مند آدمی کو خفقانی بنانے کے لئے کافی ہے۔ مگر یہ نقشہ سرکاری افسروں کی طبیعت کے عین مطابق ہے۔ سو وہ یہاں رہتے ہیں اور خوش ہیں۔ یہاں سڑکیں صاف شفاف ہیں انھیں قدموں میں روندنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہاں عمارت بڑی ہے اور آدمی چھوٹا ہے۔

(۱۱ ۹/۱۴)

خاموشی رخصت

سڑک پر رکشا پھر نظر آنے لگی ہے اور شہر کا شور واپس آگیا ہے۔
چار دن شور کم رہا اور سڑکیں کشادہ کشادہ نظر آئیں۔ اور جہاں سے گذرتے ہوئے سائیکل والوں اور کار والوں کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ جاتا تھا وہاں سے سائیکل اور کار والے ایک اطمینان کے ساتھ گذرے۔
بسوں کے انتظار میں سوکھنے والے پھر رکشاؤں اور ٹیکسیوں میں بیٹھنے لگے ہیں۔ لاہور کی سڑکیں پھر گنجان اور پُرشور بن گئی ہیں۔
ہڑتال کا ایک نقشہ میرؔ نے بھی پیش کر رکھا ہے۔

ع شور بازار سے نہیں اُٹھتا

مگر یہ ہڑتال رکشا والوں کی نہیں ہے۔ یہ اور لوگ ہیں۔ شور وہ بھی بہت کرتے تھے۔ ؎ جو اِس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

یہ میرؔ کے زمانے کی بات ہے۔ اس زمانے میں ٹریفک کا شور نہیں تھا۔ عشق کا شور تھا۔ آدمی کو بساط بھر شور تو بہرحال کرنا ہے۔ عشق کی تقریب سے کرے یا ٹریفک کے راستے سے۔

تو ایک زمانہ تھا جب آدمی کی دُنیا بہت خاموش تھی۔ سواریاں چلتی تھیں مگر چپ چاپ اور دھیرے دھیرے۔ اس زمانے میں سواری کچھ خود آہستہ چلتی تھی کچھ اہلِ دل آہستہ چلنے کا تقاضا کرتے تھے۔ ؎

ساربان آہستہ راں کا رام جانم میرود

خوبی سواری کی اُن دِنوں یہ تھی کہ بادِ بہاری بن جائے اور بادِ بہاری چلتی ہے مگر شور نہیں کرتی۔

تو اُن دِنوں بستیاں خاموش تھیں اور جنگل سائیں سائیں کرتے تھے اور کائنات آدمی کیلئے ایک ہیبت ناک خاموشی تھی۔ اس خاموشی کا کبھی یہ اثر ہوتا کہ آدمی اور خاموش ہو جاتا۔ اور صوفی بن جاتا۔ کبھی یہ ردِ عمل ہوتا کہ وہ عاشق بن کر شور کرتا۔ اور اپنی آواز کو کائنات کی آواز خیال کرتا۔ ؎

نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

دشت و در کی خاموشی نے آدمی کو ڈرایا بھی بہت اور مالامال بھی بہت کیا۔ دشت و در کی خاموشی نے پیغمبر پیدا کئے۔ حکیم و دانا پیدا کئے۔ خاموشی آدمی کے لئے بہت بڑا چیلنج تھی۔ اس میں اسے اپنی ذات گم ہوتی نظر آتی تھی۔ اپنی ذات کو

برقرار رکھنے کی کوشش تخلیقی عمل بن گئی، خاموشی نے آدمی کو فلسفہ و حکمت سے نوازا، شاعری کی دولت بخشی، عشق سے مالا مال کیا۔

شور کرنے والوں نے عاشق بن کر بہت شور کیا، اپنے نالوں سے دشت سر پر اُٹھائے اور آسمان میں شگاف پیدا کئے۔ مگر نالہ گردش سیارہ کی آواز نہ بن سکا۔ اس مشتِ خاک کی آواز آخر کائنات کی اتھاہ خاموشی میں کتنی جگہ گھیرتی۔ تو پھر اس نے کلیں ایجاد کیں، اور ایک نئی قسم کا شور پیدا کیا۔

کلیں انسانی دل سے زیادہ پُر شور ہیں۔ رکشا، موٹر، ریل گاڑی، ہوائی جہاز جٹ جہاز، خلائی جہاز، راکٹ۔ آدمی اب شور پیدا کرنے میں کامیاب ہے۔ جنگل اب سائیں سائیں نہیں کرتے اور بستیوں کے دن رات اب خاموش نہیں ہیں۔

اب بستی بستی ایک شور برپا ہے اور ہمارے آسمان پر جٹ جہازوں کا شور بہت نہ ہو مگر ہماری زمین پر رکشاؤں، ٹیکسیوں اور سکوٹروں کا شور بہت ہے۔ ٹریفک کے شور میں عشق کا شور دب گیا۔ وہ اہلِ دل اُٹھ گئے جو ساربان سے آہستہ چلنے کا تقاضا کرتے تھے۔ اب آرامِ جان سکوٹر کی پشت پر بیٹھتے ہیں۔ اور سکوٹر چلانے والے سکوٹر بہت تیز چلاتے ہیں۔

لاہور میں ٹریفک کا شور بہت ہے اور ٹریفک پولیس نے بجا سوچا کہ مسلسل شور خوب نہیں۔ شور کے سمندر میں خاموشی کے چند جزیرے بھی ہونے چاہئیں تو اس نے اس شہر میں جا بجا خاموشی کے منطقے قائم کئے۔

خاموشی کے منطقوں میں ایک منطقہ مال روڈ ہے۔ مال روڈ پر ہارن بجانا منع ہے۔ مگر نئی سواریاں ہارن کی شرمندۂ احسان ہوتے بغیر شور کرتی ہیں۔ بس مال روڈ خاموشی کا منطقہ ہے اور مال روڈ کے ٹریفک کا شور اس شہر کے سب شوروں سے بڑھ کر ہے۔ خاموشی اپنے اختیار کی چیز ہے۔ مگر شور پیدا کر کے آدمی اس پر اختیار نہیں رکھتا۔ پہلے اسے عشق کے شور پر اختیار نہیں تھا۔ اب اسے ٹریفک کے شور پر اختیار نہیں۔

ٹریفک کے شور پر اب ہمیں اختیار نہیں ہے ہم چاہیں یا نہ چاہیں یہ شور تو اب ہوگا۔ جب یہ شور نہیں ہوگا تو پھر ہڑتال ہوگی۔ اور سواری میں چلنے والے سواری کو ترسیں گے۔ مگر سواری میں ہمیں بہر حال بیٹھنا ہے۔ ہمارے اعصاب کا جو بھی حال ہو۔ میر کے زمانے میں ہمسائے کی نیند میں عاشق کے شور سے خلل پڑتا تھا۔ اب ہمسایوں کی نیندیں ٹریفک کے شور سے خراب ہوتی ہیں۔

اور نیندیں تو ہم نے خراب کرلیں مگر خاموشی کا مسئلہ تو جوں کا توں ہے۔ پہلے باہر خاموشی تھی اور وہ ہمیں ڈراتی تھی۔ اب اندر کا جہان خاموش ہے اور ہمیں خراب کرتا ہے۔

قدرت نے خاموشی تخلیق کی۔ آدمی نے جواب میں راکٹ ایجاد کئے۔ مگر راکٹ خاموشی کی فضائے بسیط میں آخر کتنا خلل پیدا کریں گے۔ چہ پدی چہ پدی کا شوربا۔ کیا آدمی اور کیا اس کے راکٹ۔

(۲۱ ۱۱/۱۴)

موٹر چلانے اور افسانہ لکھنے کے مسائل'

عورت اپنے دل کے تقاضوں سے ڈرتی ہے۔ اس لئے تخلیقی نہج پر اپنی ذات کے بھرپور شعری اظہار کی بجائے افسانے گھڑتی ہے اور موٹر چلاتی ہے۔ اور ہمارے عہد میں عورتیں موٹر بھی اچھی چلاتی ہیں اور حقیقت پسند افسانے بھی اچھے لکھتی ہیں۔ مگر شاعری میں آکر بس ہو جاتی ہیں۔ اور دل کے تقاضوں سے ڈرنے کی توضیح سجاد باقر رضوی صاحب نے یوں کی کہ اچھی شاعری دو صورتوں میں پیدا ہو سکتی ہے۔ یا تو موضوع شاعر کی ذات میں حل ہو جائے۔ یا پھر اس کی ذات موضوع میں تحلیل ہو جائے۔ پہلی صورت خود اعتمادی کی ہے اور دوسری صورت خود سپردگی کی۔ عورت میں خود اعتمادی مفقود ہوتی ہے اور خود سپردگی اس کے یہاں زندگی کی سطح پر تو ہوتی ہے مگر ادبی تخلیق کی سطح پر کم ہوتی ہے۔

سجاد باقر رضوی کا علمی استدلال اور لاہور کی ٹریفک پولیس کا مشاہدہ دونوں کا حاصل یہ ہے کہ عورتیں ریش ڈرائیونگ کی قائل نہیں ہیں۔ نہ زندگی میں نہ ادب میں۔ ایک

طرف وہ موٹر احتیاط سے چلاتی ہیں اور حادثے نہیں کرتیں، دوسری طرف وہ واردات سے بچ کر نکل جاتی ہیں. اور حقیقت پسند افسانہ لکھتی ہیں. اور سجاد باقر رضوی کے نزدیک حقیقت نگاری اور علامتی افسانہ نگاری دونوں موٹر کو تجربے کے نشیب و فراز سے بچا کر نکال لے جانے کا نام ہیں.

تجربے کے راستے کو مہارانی میرا بائی نے " اونچی نیچی راہ لپٹیلی سے تعبیر کیا تھا. اور میرا بائی اس راہ سے تو کامیاب گذری. یہ پتہ نہیں کہ آج وہ زندہ ہوتی تو ڈرائیونگ کیسی کرتی.

اصل میں گذری اتوار کو حلقۂ اربابِ ذوق میں یہ سوال زیرِ بحث آگیا تھا کہ عورتوں کی تخلیقی صلاحیت افسانے میں تو خوب پروان چڑھی ہے، شاعری میں وہ کیوں نہ پنپ سکی.

اس بحث کو کامیاب اور بامعنی بنانے کی خاطر حلقۂ اربابِ ذوق نے ادب سے تعلق رکھنے والی خواتین کو بھی اکٹھا کرنے کی کوشش کی. افسانہ نگار تو اس نے تین اکٹھی کر لیں. خدیجہ مستور، الطاف فاطمہ، خالدہ اصغر. مگر شاعرہ اردو سے کوئی دستیاب نہ ہو سکی. ہاں امریکی شاعرہ مس کیرولین کائزر یہاں موجود تھیں مگر یہاں ساری گفتگو اردو میں تھی. سو وہ کبھی کرسیٔ صدارت پر بیٹھی ہوئی خدیجہ مستور کا منہ تکتی تھیں کبھی گرما گرمی سے بولنے والوں کو حیراں حیراں دیکھتی تھیں.

سجاد باقر رضوی بولنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں مگر وہ ایک وقت

میں دو کام نہیں کر سکتے۔ اُنھوں نے ابھی ابھی مقالہ پڑھا تھا۔ سوا اعجاز حسین بٹالوی کا کوئی حریف نہیں رہا۔ حریف نہ پاکر وہ اور بھی چمکے۔

اعجاز حسین بٹالوی یہ کہہ رہے تھے کہ شاعری میں عورت کے آگے نہ آنے کے تاریخی اسباب بھی ہیں۔ اس پر اظہار کے راستے بند تھے۔ وہ نہ باہر نکل سکتی تھی، نہ مشاعروں میں پہنچ سکتی تھی۔ جب ہماری معاشرتی تاریخ بدلی اور عورت پردے سے باہر آئی اور کالج میں پہنچی تو اس نے ادب میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور ایک سے ایک بڑھ کر افسانہ نگار پیدا ہوئی"۔

اِس پر پروفیسر سعادت علی خاں نے یہ سوال اٹھایا کہ تاریخی حالات کی اس تبدیلی کے ساتھ ہمارے ہاں عورت نے افسانے کے شہر ہی کا رُخ کیوں کیا۔ شاعری کی طرف اس کی طبیعت کیوں نہیں آئی۔

پروفیسر صاحب نے بہت بزرگانہ شفقت سے کام لیا۔ اور خاتون لکھنے والیوں سے بہت کہا کہ بیبیو کچھ تو کہو۔ مگر اُنھوں نے گونگے کا گُڑ کھایا تھا۔ جب محترمہ صدر سے انھوں نے یہ سوال کیا کہ آپ ہی بتائیں آپ افسانے کی طرف کیوں مائل ہوئیں اور شاعری پر کیوں دل نہیں آیا۔ تو اُنھوں نے بھی بس اتنا ہی کہنا مناسب سمجھا کہ یہ تو اللہ میاں سے پوچھیے۔

تو ایک جواب تو یہ تھا کہ مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے شاعر بناتا ہے جسے چاہتا ہے افسانہ نگار بناتا ہے۔ اس نے

عورت کو افسانہ نگاری کی صلاحیت ہی ودیعت کی ہے۔ مگر اعجاز حسین بٹالوی بحث کرتے کرتے آخر سجاد باقر رضوی کی راہ پر آگئے اور اُنھوں نے یہ استدلال کیا کہ شاعری جس عمل کا تقاضا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ؏

آپ اپنی آگ میں خس و خاشاک ہو گئے

یہ عمل مرد تو کر گذرتا ہے مگر عورت اس عمل سے کتراتی ہے۔

ایک عورت اپنی آگ میں خس و خاشاک ہوئی اور میرا بائی بن گئی۔ مگر یہ واقعۂ عظیم تو برعظیم کی تاریخ میں ایک بار ہی گزرا۔ ہندو تہذیب کی روایات بھی برقرار رہیں اور ہند اسلامی تہذیب بھی خوب پروان چڑھی۔ مگر پھر اس خاک سے کوئی میرا بائی نہ اٹھی۔ پھر عورت نے آگ فراہم کی اور خس و خاشاک ہونے اور شاعر بننے کا کام مرد کے لئے چھوڑ دیا۔ مگر دوستو اس میں شاعری اور افسانے کی تفریق کیوں؟ تخلیقی عمل ہے ہی اپنی آگ میں خس و خاشاک ہونے کا معاملہ سو افسانہ نگار کیا یورپ میں اور کیا ہماری تاریخ میں اوسط کی سطح پر آکر ٹھہر جاتی ہیں۔ کوئی عورت اپنی آگ میں یوں خس و خاشاک نہ ہوئی کہ دوستو یفسکی یا لارنس بن جاتی ———۔

(۱۲/۶۴ء)

تہذیب بذریعہ دسترخواں

ہندو مسلم
کھانے کا فرق

مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی تہذیب الگ ہے اور مسلمانوں کی تہذیب الگ ہے۔ وہ اس طرح سے کہ کھاتے وقت ہندو رکابی کے بیچوں بیچ ہاتھ ڈالتا ہے اور مسلمان رکابی کے ایک کنارے سے کھانا شروع کرتا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب میں اس حد تک ضرور اشتراک پایا جاتا ہے کہ دونوں پہلا نوالہ اللہ کے نام کا توڑتے ہیں۔ مگر پھر دونوں کی تہذیبیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ہندو پرماتما کے نام کا نوالہ توڑ کر گنتی بلّی یا چڑیوں کو کھلا دیتا ہے۔ مگر مسلمان بسم اللہ کہہ کر نوالہ خود ہڑپ کر جاتا ہے۔

یہ تجزیہ مشرقی پاکستان کے شمس العالم صاحب سی ایس پی کا ہے۔ عمرانی کانفرنس کے ذیل میں ایک مباحثہ پاکستان کے تہذیبی مسائل سے متعلق تھا۔ اس میں مختلف اصحاب نے مقالے پڑھے اور سوال کرنے والوں نے مختلف سوال کئے۔ سب سے دلچسپ مقالہ شمس العالم صاحب کا تھا۔ انھوں نے بہت

بال کی کھال نکالی اور تہذیبوں کی چھان پھٹک کی۔

شمس العالم صاحب نے تہذیبوں کا فرق ثابت کرنے کی کوشش میں جزئیات نگاری کا حق خوب ادا کیا، کھانے پینے میں، چلنے پھرنے میں، اٹھنے بیٹھنے میں، رہنے سہنے میں جہاں ذرا فرق نظر آیا اسے انھوں نے پکڑ لیا۔

ہم آپ یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان اور ہندو میں فرق یہ ہے کہ مسلمان گوشت خور ہے اور ہندو ساگ پات کھاتا ہے۔ اور بنگال پہنچ کر بے شک مچھلی کھالے مگر گائے کا گوشت کبھی نہیں کھائے گا۔ مگر شمس العالم صاحب کھانے کے معاملہ میں بہت وقت شناس اور دور رس ہیں۔ دسترخوانوں کا مطالعہ انھوں نے بڑے علمی انداز میں کیا ہے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ دسترخوان پر ہندو کی روش مصالحانہ ہوتی ہے مگر مسلمان کا انداز جارحانہ ہوتا ہے۔ ہندو غذا سے مصالحت کر لیتا ہے مگر مسلمان غذا کو چیلنج کے طور پر قبول کرتا ہے۔ وہ خوب مرچیں کھاتا ہے اور خوب سالن میں گھی ڈالتا ہے۔ مگر ہندو مرچوں سے خائف ہیں۔ اور گھی سے گھبراتے ہیں۔ پس مسلمانوں نے غذا کا چیلنج قبول کیا ہے اور اس لئے اس کی قوتِ ہضم زیادہ ہے۔ ہندوؤں نے غذاؤں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اس لئے ان کا ہاضمہ ذرا نرم ہے۔

ہندو کی رکابی بڑی ہوتی ہے مسلمان کی رکابی چھوٹی ہوتی ہے۔ ہندو ایک بڑی رکابی میں سب قسم کے سالن اکھٹے اتارتا ہے اور اکٹھا کھاتا ہے۔ مسلمان پہلے ایک ڈش کو صاف کرتا ہے پھر دوسری ڈش کا صفایا کرتا ہے۔ پھر تیسری ڈش پر للچاتا ہے۔

مگر یہ تو روایتی دستر خوان کی بات ہے۔ ڈائننگ ٹیبل پر تو مسلمان بھی یہی کرتے ہیں کہ ایک پلیٹ میں مختلف کھانوں کو جمع کرتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ گویا ہندو کی تھال پرات تک جدید مسلمان ڈائننگ ٹیبل اور چھری کانٹے کے راستے پہنچا ہے۔

ویسے شمس العالم صاحب کا استدلال اپنی سمجھ میں تو آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ مولوی حضرات تو ہندو اور مسلمان کے سارے تہذیبی اختلاف کو مذہبی عقائد کے اختلاف تک محدود رکھتے ہیں۔ لیکن تہذیب تو وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے عقائد و خیالات لوگوں کے طرزِ عمل میں رچنا بسنا شروع کرتے ہیں۔ ان کے رویوں کو جنم دیتے ہیں اور ان کے روزمرّہ کے طور طریقوں میں گھر کر جاتے ہیں۔ شمس العالم صاحب کا استدلال یہ تھا کہ مذہبی عقائد نے مسلمانوں کے یہاں ایک مخصوص طرزِ عمل کو، طور طریقوں کے ایک سانچے کو جنم دیا ہے۔ ہندوؤں کا مذہبی عقیدہ اپنی جگہ پر پختہ ہے۔ اس عقیدے نے ان کی زندگی میں طور طریقوں کے کچھ سانچوں کو پیدا کیا ہے۔ ان کے روزمرّہ کے مشاغل میں، معمولی سے معمولی کام میں ان سانچوں کو بر سرِ عمل دیکھا جا سکتا ہے۔

شمس العالم صاحب نے ہندو تہذیب اور مسلمان تہذیب میں پھولوں کے واسطے سے بھی فرق کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مشرقی پاکستان میں ہندو پھولوں کے بہت والہ و شیدا ہیں۔ مگر گلاب سے بہت بیزار ہیں۔ اسے وہ مسلمانوں کا پھول سمجھتے ہیں۔

اس استدلال سے ہم نے یہ جانا کہ ہر تہذیب کی اپنی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ اور خوشبوؤں کے متعلق اپنا ایک تجربہ ہوتا ہے۔ ہندو تہذیب نے جن پھولوں کے واسطے سے خوشبو کا تجربہ حاصل کیا ہے ان میں مرکزی حیثیت گیندے کو حاصل ہے۔ ان کی مقدس تقریبوں میں یہ پھول مخصوص طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ہندی مسلمان کا خوشبو کا تجربہ گلاب اور موتیا کے واسطے سے ہے۔

یہ بات اگر درست ہے تو ہم اگر مغربی پاکستان کے معزز مسلمانوں کی کوٹھیوں میں انگریزی پھولوں کی فراوانی دیکھیں تو کیا نتیجہ مرتب کریں۔ کیا دیسی پھولوں سے نفور اور انگریزی پھولوں سے عشق کا مطلب یہ ہے کہ اس علاقہ میں مسلمانوں کا اعتبار اپنے شامہ سے اُٹھ گیا ہے۔ اب وہ دوسری تہذیب کی ناک سے خوشبو کا تجربہ حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔

اصل میں خود شمس العالم صاحب کو یہ احساس ہے کہ اُنھوں نے روزمرّہ تجربوں اور معمولات سے جو تہذیبی رنگ کا تعین کیا ہے اس کا مشاہدہ دیہاتی زندگی کی حد تک تو کیا جا سکتا ہے مگر شہروں میں جو نیا طبقہ پیدا ہو رہا ہے اس کے حوالے سے تہذیبی وضع کا یوں مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۲۵ ۲/۶۵)

فلسفہ، سائیکل، پھٹا ہُوا سر اور شاعری

اُدب کو تو ٹوہ کر دیکھ لیا۔ اب چند نوجوان اس فکر میں ہیں کہ فلسفی بن جائیں۔ فلسفیوں کی انجمن قائم کرنے کے لئے جدّ و جہد کئی ماہ سے جاری ہے مگر ہر مرتبہ یا تو کسی کو چھینک آجاتی ہے یا بلّی رستہ کاٹ جاتی ہے اور انجمن بنتے بنتے رہ جاتی ہے۔ پچھلے مہینے باقاعدہ دعوت نامے جاری ہو گئے تھے۔ ٹی ہاؤس کی بالائی منزل پر لاہور کے نوزائیدہ فلسفیوں کو جمع ہونا تھا۔ مگر جب وہ وقت آیا تو جو وہاں گیا اُس نے داعیان میں سے کسی کو نہ پایا۔ بعد میں پتہ چلا کہ دعوت دینے والے فلسفی کی رگ کشا اُلٹ گئی اور وہ ٹی ہاؤس آتے آتے میو ہسپتال چلا گیا۔ اور آپ نے اس فلسفہ زدہ شخص کی حکایت سُنی ہو گی جس نے سراسر فلسفہ میں ڈوبا ہوا یہ سوال اٹھایا تھا کہ خدا اگر ہے تو نظر کیوں نہیں آتا۔ اور درویش نے اس کے سر میں ڈھیلا مارا۔ پھر جب اُس نے سر میں درد کی شکایت کی تو درویش نے کہا کہ درد اگر ہے تو نظر کیوں نہیں آتا۔ یوں اس شخص کے سر سے فلسفہ کا بھوت اُترا۔ مگر ٹی ہاؤس کے نوجوان دانشوروں کے

سر میں سمایا ہوا سودا اور قسم کا ہے ۔ ؏

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اُتار دے

یہاں بیٹھنے والے ایک شاعر نے اعلان کیا تھا کہ جب میں غزل نہیں لکھ سکوں گا تو پھٹا ہوا سر لے کر ٹی ہاؤس میں آؤں گا۔ اس شاعر کا نام احمد مشتاق ہے۔ کہ ہنوز سالم سر لے کر ٹی ہاؤس میں آتے ہیں۔ مگر نوخیز دانشور عارف امان نے اس اعلان کی امانت کو اپنے کاندھوں پر اُٹھایا اور میو ہسپتال سے نکل کر اپنے مرہم پٹی سے آراستہ سر کے ساتھ ٹی ہاؤس میں داخل ہوئے۔ اور فلسفیوں کے اجتماع کی نئی تاریخ کا اعلان کیا۔

مدعوعین مقررہ تاریخ اور مقررہ وقت پر پھر پہنچے۔ دعوت دینے والوں نے ان کی بہت آؤ بھگت کی۔ پھر میز پر بکھرے ہوئے دانشوروں کو سمیٹا گیا اور چلے بالائی منزل کی طرف۔ مگر تھوڑی دیر میں وہ سب مُنہ لٹکائے نیچے اُترے۔ بات یہ تھی کہ وہاں سائیکل والوں کی کوئی تقریب ہو رہی تھی۔

نئی پود اور سائیکل والوں سے دب جانے۔ یہ سوچ کر بہت سے دانشور بہت بپھرے۔ مگر کچھ صلح پسند بھی تھے۔ ان کا نقطۂ نظر کچھ اس قسم کا تھا کہ جس طرح ایک ہی عہد میں سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام پہلو بہ پہلو پھل پھول سکتے ہیں اسی طرح سائیکل والے اور فلسفہ و دانش والے بھی ایک ہی چھت کے نیچے سانس لے سکتے ہیں اور ایک بات اور بھی تو ہے ۔ وہ یہ کہ سائیکل میں پریشان کن چیز سائیکل

کی گھنٹی ہے۔ مگر دادائیت (DADAISM) والوں نے جب اپنا پہلا اجلاس کیا تھا تو کسی بھی قسم کے خطرے کی گھنٹی کا خوف ادیبوں کے دلوں سے زائل کرنے کے لئے انھوں نے یہ اہتمام کیا کہ تقریریں بھی ہوتی رہیں اور گھنٹی بھی مستقل بجتی رہی۔ اس طرح یورپی ادب کی اس انوکھی تحریک نے ادب کی بلّی کے گلے میں گھنٹی باندھی۔ اور ادب تخلیق کرنے کا نسخہ یہ تجویز کیا کہ جس روز نظم لکھنی ہو اس روز کے اخبار میں سے کسی خبر کو تراشو پھر قینچی سے کاٹ کر اس کا ایک ایک لفظ الگ کرو۔ پھر ان لفظوں کو بساط پر بکھیر دو۔ پھر جو ان کی ترتیب ہو اسی ترتیب سے وہی لفظ ایک کاغذ پر لکھ لو۔ وہ اس عہد کی نئی شاعری ہوگی۔

ٹی ہاؤس میں شاعری پیدا کرنے کے اس نسخہ پر تو پہلے ہی سے عمل ہو رہا ہے۔ اور ادب کی بلی کے گلے میں گھنٹی بندھ چکی ہے سو سائیکل کی گھنٹی کس گنتی میں ہے۔ پس نوجوان فلسفی پھر اوپر کی سمت روانہ ہوئے۔ مگر اسی اثناء میں سائیکل والے آ چکے تھے۔ اور سب کرسیاں پُر ہو چکی تھیں۔

تب نوخیز فلسفیوں نے ٹی ہاؤس سے نکل کر وائی ایم سی اے کا رُخ کیا۔ اور وہاں کے چائے خانے میں اپنا اجلاس کیا۔ اندر سے آنے والے ایک صاحب سے ہم نے پوچھا کہ یار، صدارت کون کر رہا ہے۔ اس نے سر کھجایا، پھر بولا۔ مجھے تو ایسا لگا کہ سب ہی صدارت کر رہے ہیں۔ اور ہمیں دادائیت والوں کا پہلا اجلاس پھر یاد آیا جس میں یہ طے پایا تھا کہ جو اس اجلاس میں شریک ہے وہ اس جلسہ کا صدر ہے۔

پس جب صدارتی تقریر کی نوبت آئی تو پورا مجمع کھڑا ہوگیا اور سب نے بیک وقت اپنی اپنی تقریر شروع کردی۔

اصل میں پاک ٹی ہاؤس عبرت کدۂ ادب ہے۔ یہاں نسلیں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں اور گزرتی چلی جاتی ہیں۔ لکھنے والا جب تک جونیئر ہے ٹی ہاؤس میں وہ پورے اعتماد سے دندناتا ہے۔ جہاں ذرا سینئر ہوا تو شور اٹھتا ہے کہ یہ پرانی نسل ہے۔ لیجیو، ووڑیو۔ پھر یہ ادیب یا تو ٹی ہاؤس سے اٹھ کر گھر چلے جاتے ہیں یا گھر واپس جانے کو جی نہ چاہے تو کسی دوسرے ریستوران میں بسیرا کرتے ہیں۔

بہرحال ادیب کے لئے ہجرت کے سو راستے کھلے ہوئے ہیں مگر بیٹھر اور دانشور اپنی جگہ پر بھاری ہوتے ہیں۔ دانشور جب تک چائے خانے کی میز پر بیٹھا ہے بھاری پتھر ہے۔ جب وہ یہاں سے ہلتا ہے تو گلی کا روڑا بن جاتا ہے۔ مگر اس کے ہلنے کا ہمیشہ خطرہ رہتا ہے کیونکہ دانشور وہ مخلوق ہے جو چوراہے پر کھڑی ہوئی ہے۔ ایک سمت قدم بڑھائے تو وہ سیاست داں ہے، دوسری سمت قدم اٹھائے تو ادیب ہے۔ تیسری سمت قدم اٹھائے تو فلسفی ہے اور چوتھی سمت قدم مارے تو سی ایس پی افسر ہے۔ چائے خانے کی میز سے اُٹھ کر دانشور اِن میں سے کسی بھی راہ پر پڑ سکتا ہے۔ مگر یہ سب راستے دانشور کو غیر دانشور بنانے کے راستے ہیں۔ دانشور وہ ہے جو چائے کی میز پر بیٹھے اور ادب، سیاست، فلسفہ سب پر یکساں روانی سے گفتگو کرے۔ اور جنگ و جدل کرے۔

اور آخر میں ٹی ہاؤس کے بیروں کا ذکر بھی لازم ہے جن کا سلوک
نوخیز ادیبوں کے عروج و زوال میں بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔ اب اگر الٰہی اور
بابو کسی نو وارد، نوخیز دانشور کی میز پر ڈیڑھ گھنٹے کے بعد آ کھڑے ہوں اور آرڈر
مانگنے لگیں یا بل پیش کر دیں تو وہ آخر کتنے دن اور کتنی دیر یہاں بیٹھ سکے گا۔

(۶۵ء)

کلیجہ کھانے والا گمنام پرندہ

ایک پرندہ ہے جو شاکر علی کے اندر بیٹھا ہے اور ان کے کلیجہ میں چونچیں مارتا رہتا ہے۔ جب وہ اسے پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ تڑپ کر ہاتھوں سے نکل جاتا ہے۔ شاکر علی کہتے ہیں کہ آپ میری تصویروں کو کان لگا کر سنئے اس پرندے کا راگ آپ کو سنائی دے گا۔

پاکستان کونسل میں سامعین جو نئے پاکستانی مصوروں کے اس امام کو دیکھنے اور سننے آئے تھے اس بیان پر بہت متجسس ہوئے۔ اُنھوں نے بہت کریدا کہ یہ پرندہ کون سا ہے۔ کبوتر، طوطا، مینا، بلبل، ہریل، ڈومنی، بیا، شام چڑی، دھوبن چڑیا، نیل کنٹھ، لال، بدری، کھوسٹ، مگر شاکر علی کو خود یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ پرندہ کونسا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ تخصیص کے قائل نہیں ہیں۔ ان سے یہاں کسی نے مقامی رنگ کی بات کی تھی تو اُنھوں نے یہ بات کہہ کر رد کر دی کہ مقامی رنگ کیا ہوتا ہے۔

اَب سے دس برس ادھر کی بات ہے کہ اس شہر کے کافی ہاؤس میں ایک اجنبی شخص داخل ہُوا۔ چپ چاپ، اپنے آپ میں کھویا ہُوا۔ سر کے بال لمبے جیسے ابھی پن چکّی سے اُٹھ کر آیا ہو۔ ہم نے ایک نوخیز نقّاد سے پوچھا کہ :

" یہ کون بزرگ ہیں ؟ "

اس نے نہایت اعتماد کے ساتھ ہمیں مطلع کیا کہ یہ شخص ایشیا کا سب سے بڑا تجریدی مصوّر ہے۔ اس کا نام شاکر علی ہے۔

مردان شوگر فیکٹری کے بعد ایشیا کی یہ دوسری سب سے بڑی پاکستانی شے کافی ہاؤس میں دریافت کی گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان نوخیز لکھنے والوں کی مَسیں بھیگنے لگی تھیں جنھوں نے پاکستان کے جنم کے فوراً بعد قلم اٹھایا تھا اُنھوں ناصر کاظمی کو اپنا ہیرو بنایا۔ اور ٹی ہاؤس کے فلور سے اپنے نئی نسل ہونے کا اعلان کر دیا۔

اُس سے پہلے کی ادبی تحریکیں اور تو سب مال فراہم کر لیتی تھیں مگر مصوّری کا مال ان کے پاس نہیں ہوتا تھا۔ اس نئی نسل نے شاکر علی کے دم کو بہت غنیمت جانا اور شاکر علی نے جانے کیا جادو پھونکا کہ دیکھتے دیکھتے کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس کی ہر میز پر تجریدی مصوّری کا ایک غیرنشیل کالج آف آرٹس کھل گیا۔ اور سگریٹ کی ڈبیوں اور چائے کے بلوں کی پشت پر تجریدی تصویریں بننے لگیں۔

یہاں نوخیز مصوّر بہت عجلت میں بالغ ہوئے۔ لکھنے والوں کے ساتھ نئی

نسل میں شامل ہو کر انھوں نے بھی پچھلوں سے بغاوت کا اعلان کر دیا۔ لکھنے والوں کے پاس قلم تھا، اور رسالے تھے۔ انھوں نے اس نئے دستہ کی اخلاقی حمایت کو اپنا فرض سمجھا اور تجریدی مصوری کی وکالت شروع کر دی۔

ان دنوں ان باولوں کے سامنے صرف ادب اور آرٹ کے مسائل تھے۔ زندگی کے مسائل نہیں تھے۔ ادب اور آرٹ ان پر جنون بن کر سوار ہو گئے تھے۔ مگر شاکر علی پاکستان کونسل میں یہ کہہ رہے تھے کہ پھر یہ جنون اُترنے لگا۔ نئی نسل آرام طلب ہو گئی۔

شاکر علی نے سچ کہا۔ خود شاکر علی کا معاملہ یہ ہے کہ اب ان کے اندر کا پرندہ نیشنل کالج آف آرٹس کے پنجرے میں مگن ہے تخلیقی کام کرنے والوں کی تقدیر بُری ہے۔

مگر آج پرندہ پنجرے سے باہر تھا۔ شاکر علی بھی کسی کی بات سُننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ بہت اونچے مقام سے بول رہے تھے۔ اس کا انھوں نے اعلان بھی کر ڈالا۔

ایک صاحب انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ آخر آرٹسٹ لوگوں ہی میں سے ہوتا ہے۔ شاکر علی نے فوراً اعلان کیا کہ نہیں آرٹسٹ لوگوں میں سے نہیں ہوتا وہ ان سے الگ ہوتا ہے۔ تنہا ہوتا ہے۔ یہی تو اس کا المیہ ہے۔

جب عوام کا ذکر آیا تو شاکر علی نے صاف کہہ دیا کہ عوام کو تو میں سمجھا

جانتا ہوں۔ میں ان کے برابر کھڑا ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں اونچے مقام پر کھڑا ہوا ہوں اور میں ہی نہیں ہر لکھنے والا اونچے مقام پر کھڑا ہوتا ہے۔ بھیڑ کے ساتھ کاندھا ملاکر وہ کبھی نہیں چلتا۔

حاضرین نے سوالات کی بہت بوچھاڑ کی مگر آرٹسٹ اپنی ترنگ میں تھا۔ کسی سوال پر وہ ثقہ عالمانہ انداز میں گفتگو کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ میں کوئی علامہ قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ میں مصوّر ہوں۔

شاکر علی نے اگر علمی انداز میں کسی سوال پر بحث بھی کی تو وہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اور جس سوال کا جواب مصوّر والے غرور کے ساتھ دیا گیا وہ جواب پاکر سوال کرنے والے نے اپنے آپ کو بہت چھوٹا محسوس کیا۔

بہرحال شاکر علی کا بولنے کا اپنا طریقہ ہے۔ اس طریقہ میں لازم نہیں کہ فقرہ مکمل بھی ہو وہ فقرہ آدھا پونا بھی ہو سکتا ہے کہ جس لفظ سے فقرہ شروع ہو اسی لفظ پر تمام ہو جائے۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ شاکر علی انگریزی رواں نہیں بولتے وہ اردو بھی آدھ کٹا ہی بولتے ہیں۔

(۱۱ ۶/ ۶۵)

کُرتا، غزل اور سیاست

اِن دِنوں گرمی بہت ہے۔ مگر کُرتے کم نظر آتے ہیں۔ لیجئے کُرتے کا مضمون پھر آگیا۔ مگر یہ ذرا نازک مضمون ہے۔ کُرتے کا ذکر کرنا تلوار کی دھار پہ چلنا ہے۔ قباحت اِس مضمون میں یہ ہے کہ بات مضمون تک نہیں رہتی۔ خواہ مخواہ اہلِ مضمون تک چلی جاتی ہے۔ مگر یہاں بات صِرف کُرتے کی ہوگی۔ ع

رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

اور اگر یہ صحیح ہے کہ کُرتے کو آدمی سے الگ رکھ کر نہیں دیکھا جاسکتا تو پھر یوں سمجھ لیجئے کہ کھدر کے کُرتے کے خلاف یہاں جو بات کہی جائے گی وہ آنجہانی گاندھی جی کے خلاف ہوگی۔ اڑوس پڑوس کو نشانہ بنانا مقصود نہیں ہے۔ ہاں مگر کل گورنمنٹ کالج سے نکلتے ہوئے ایک کھدر پوش طالبہ کہہ رہی تھی کہ جو گیا کھدر تو آجکل ہر ایرا غیرا لڑکی لادے پھر رہی ہے۔ مگر میں نے اس میں کچھ جدتیں پیدا کی ہیں۔ اور ہم نے سَر سے پَیر تک اس کھدر کی پوشاک کو دیکھا۔ اور یہ دیکھ کر مشوش ہوئے کہ اس میں فیشن

بننے کے سارے امکانات موجود ہیں۔

کھدّر میں ایک عیب یہ ہے کہ اسے سیدھے سچے لباس کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جاتا۔ یا تو وہ کوئی تحریک ہوتی ہے یا فیشن بن جاتی ہے۔ گاندھی جی کے وقت میں ہر کھدر پوش آدمی کو دیکھ کر یہ شک گزرتا تھا کہ اس شخص نے لباس زیب تن نہیں کیا ہے بلکہ ایک سیاسی نظریہ پہن رکھا ہے۔ اس وقت سے کھدر کی یہ تقدیر چلی آرہی ہے کہ اسے محض کپڑے کی حیثیت میں تسلیم نہیں کیا جاتا اس کا دامن کسی نہ کسی سیاسی خیال یا معاشرتی اصلاح کے کسی تصوّر سے باندھ دیا جاتا ہے۔ اور اس زمانے میں جب کہ سیاسی فکر اور معاشرتی اصلاح کے تصورات کو ہم نے پرانے لباسوں کی طرح اُتار پھینکا ہے۔ کھدر کی بشرٹ اور کھدر کا کُرتا پہن کر ہم اپنی اس برہنگی کو چھپانا چاہتے ہیں ـــــ،

کھدّر کے کُرتے اور ململ یا وائل کے کُرتے میں فرق یہ ہے کہ کھدر کا کُرتا یا تو نظریہ ہوتا ہے یا نظریئے کے فقدان کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ ململ اور وائل اور چکن کے کُرتے نظریات نہیں ہیں۔ سیدھا سچا لباس ہیں۔ یہ کرتے کسی سیاسی تحریک کی یاد نہیں دلاتے۔ بلکہ ایک تہذیب کو سامنے لاتے ہیں۔ ممکن ہے یہ سن کر کوئی کھدر پوش انٹلکچوئل DECADENT کلچر کی اصطلاح زبان پر لائے۔ اس اصطلاح کو گالی کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کی تعریف یوں بھی ہو سکتی ہے کہ تہذیب کی یہ وہ سطح ہے جہاں چیزیں بہت مصفّا ہو جاتی ہیں اور نفاست اپنے درجۂ کمال کو پہنچ

جاتی ہے۔ کچھ چیزیں مصفّا ہو جاتی ہیں، کچھ منجھا ہوا تخیل انھیں مصفّا بنا دیتا ہے۔
اور نظریوں کام کرتی ہے ؎

رشکِ آئینہ ہے اس رشکِ قمر کا پہلو
صاف ادھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

جب جسم اتنے مصفّا ہوں کہ پان کی پیک گلے کی جلد سے دمکتی نظر آئے اور نفاست اس درجہ پر ہو کہ دیکھے سے چیزوں کے میلا ہو جانے کا گمان ہو تو پھر اس تہذیب میں کپڑا بھی اسی حساب سے تیار ہوگا یعنی ململ کا پورا تھان ہوگا مگر انگوٹھی میں سما جائے گا۔

جب ڈھاکہ کی ململ کا دور گزر گیا اور ہنرمندوں کے ہنر پر پانی پھر گیا تو ایک زمانے بعد گاندھی جی کا چرخہ آیا۔ اور کھدر نے اپنا ظہور کیا۔ اس چرخہ کے بھی ایک معنی تھے اور کھدر پوشی کا بھی ایک مفہوم تھا۔ مگر جن نفاست پسند دلوں نے ڈھاکہ کی ململ کی یاد میں ململ اور وائل اور چکن کو شعار کیا ان کی روش کا بھی ایک تہذیبی مفہوم تھا۔ تجزیہ کیجیے تو نقطۂ نظر یہ برآمد ہوگا کہ لباس اور ادب کو سیاست کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔ کرتا اور غزل دونوں نفیس و پاکیزہ اصناف ہیں۔ انھیں شاعری رہنا چاہیے نعرہ نہیں بننا چاہیے۔ وائل کا کرتا شاعری ہے، کھدر کا کرتا ایک نعرہ ہے۔ اور بس۔

مگر ایک دوست نے ایک دوست کو وائل کا کرتا پہنے دیکھا اور

پھر اس کے اس ہاتھ پر نظر کی جس میں ایک رومال، ایک موٹر کی چابی، ایک پائپ کے تمباکو کا پاؤچ اور ایک بٹوہ تھا۔ اور اس نے کہا کہ کرتے میں ایک جیب بھی لگوا لی ہوتی۔ اس کرتا پوش نے جواب دیا کہ جیب کھدر کے کرتے میں ہوا کرتی ہے۔ باریک کرتا جیب کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تو دوستو باریک کرتے کا ایک پہلو یہ ہے۔ یہ کرتا تو جاگیرداری دَور کی پیداوار ہے۔ صنعتی دور کے نئے آدمی کے ساتھ ہزار طرح کے دُم چھلے لگے ہوئے ہیں۔ ہلکا پھلکا کرتا ان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

مگر جو خود ہلکے پھلکے ہیں وہ اس کرتے پر ایک دم سے ریجھ کر ایک دم سے کیوں بیزار ہوئے۔ کیوں ایسا ہوا کہ پچھلے برس مال روڈ پر اور کلچرل تقریبوں میں سبز گلابی کرتے بہت نظر آتے تھے اور اس برس جدھر دیکھو موٹا جھوٹا جو گیا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ کرتا بھی کھدر کا، قمیص بھی کھدر کی۔ کل تک جو گُلبدن تھے اب کھدر بدن ہیں ——

یہ زوال کس کا ہے۔ کرتے کا یا ذوقِ لباس کا۔؟

(۲۶/۹/۶۵)

غزل، کریلے اور علی گڑھ کے اکے

علی گڑھ کے اکّے اور میر پر لکھی ہوئی تنقید، ان دو مسائل کے بارے میں پروفیسر رسل نے ضرور انگریزوں والی مصلحت اندیشی سے کام لیا اور رائے دینے سے صاف دامن بچا لیا۔ باقی ہر بات اُنھوں نے بے تکلّف کی۔

گارڈینیا میں کل شام ایک تقریب ہوئی تھی۔ اس تقریب کو ایک پنتھ دو کاج کہیے۔ اردو کے ایک انگریز پروفیسر سے بھی تعارف ہو گیا۔ اور ڈاکٹر وحید قریشی کی نقاب کشائی بھی ہو گئی۔ ادبی حلقوں نے رفتہ رفتہ مایوس ہو کر یہ سوچ لیا تھا کہ انتخابات بے شک ہو چکے ہوں بہر حال رائٹرز گلڈ کے ریجنل سیکرٹری قتیل شفائی ہی رہیں گے۔ مگر گارڈینیا کی تقریب میں لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ڈاکٹر وحید قریشی سیکرٹری بنے بیٹھے تھے۔

پروفیسر رسل لندن یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر ہیں۔ اُردو سے ان کی شناسائی کی تقریب دوسری جنگِ عظیم ہے۔ ان دنوں وہ جنگی ملازمت

کے واسطے سے ہندوستان پہنچے۔ اور آسام میں گھومے پھرے۔ یہاں اُنھوں نے اُردو بولنی سیکھی۔ پھر اس زبان کا انھیں ایسا چسکا لگا کہ واپس وطن گئے تو لنڈن یونیورسٹی میں باقاعدہ اُردو کی تعلیم حاصل کی۔

اُردو پڑھ لکھ کر اُنھوں نے پھر ہندوستان کا رُخ کیا۔ دلّی، لکھنؤ، علی گڑھ حیدرآباد غرض شہر شہر کا پانی پیا اور اردو چکھی۔ ویسے وہ حیدرآباد کے زیادہ قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہاں لوگ اردو سے زیادہ انس رکھتے ہیں۔

اس شہر میں ان کا تیسرا پھیرا ہے۔ ایک مرتبہ وہ ۵۳ء میں آئے۔ دوسری مرتبہ ۵۸ء میں آئے۔ اور اب پھر وہ اس شہر میں ہیں۔

رسل صاحب جب ۵۸ء میں لاہور آئے تھے تو اُنھوں نے اورینٹل کالج میں بیٹھ کر پان بھی بہت کھائے اور میرؔ کی غزلوں کی تعریف بھی بہت کی۔ اب آئے ہیں تو میرؔ کے تو وہ بدستور قائل ہیں مگر پان کی طرف ان کی طبیعت نہیں آئی۔

رسل صاحب علی گڑھ بہت رہے ہیں۔ اور ابھی ابھی وہ مسلم یونیورسٹی والے خورشید الاسلام صاحب کے ساتھ مل کر غالبؔ پر کام کر کے آ رہے ہیں۔ علی گڑھ کے وہ مداح ہیں۔ مگر وہاں کے اکّوں کے بارے میں اُنھوں نے اپنی رائے محفوظ رکھی۔ حالانکہ اکّے کے بارے میں ایک ایسے شخص کی رائے بہت معنی رکھ سکتی تھی جو ریل گاڑی اور ہوائی جہازوں کے شہر میں پیدا ہوا ہے۔ شاید انھیں دوبارہ علی گڑھ جانا ہے اور وہ جانتے ہی ہوں گے کہ علی گڑھ والے اپنے اکّے کے بارے

میں بہت حساس ہیں۔

اسی احتیاط کا مظاہرہ اُنھوں نے تنقیدِ میر کے بارے میں کیا۔ وہ میر کے بہت مداح ہیں۔ ہم نے گزارش کی کہ میر کی شاعری پر اُردو میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی نظر سے گزرا۔ ؟

اس سوال کو اُنھوں نے نہایت خوبصورتی سے ٹالا۔ فرمانے لگے کہ کسی شاعر پر تنقید میں پہلے تو یہ سوچ کر نہیں پڑھتا کہ شاعر کو تو پڑھ لوں۔ پھر اس پر تنقید پڑھوں۔ مگر جب شاعر کو پڑھ لیتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ شاعر کو تو پڑھ ہی لیا اب اس پر تنقید پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔

مگر شاید داستانوں پر تنقید انھوں نے پڑھی ہے۔ اس تنقید سے وہ سخت ناراض تھے۔ کہتے تھے کہ داستانوں پر جو اعتراضات ہوئے ہیں وہ سب فضول ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انگریزی کے اثرات نے اُردو والوں کو بہت گمراہ کیا ہے۔ داستان پر لکھتے ہوئے وہ فوراً ٹالسٹائی اور ڈکنز کی طرف دوڑتے ہیں۔ اور انھیں اپنا سارا افسانوی ادب بے معنی نظر آتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے رسل صاحب کو داستانِ امیر حمزہ کا خیال آیا جس کے کچھ حصے انھوں نے پڑھے ہیں۔ اُنھیں بہت افسوس تھا کہ اُردو میں داستانِ امیر حمزہ پر کوئی کام نہیں ہوا۔ اور کوئی کام کی کتاب نہیں لکھی گئی۔

رسل صاحب کے نزدیک اُردو ادب کو انگریزی ادب کے حوالے سے

بیماری اور شاعری

آدمی ہاکی کو نہیں چھوڑتا۔ ہاکی آدمی کو چھوڑ دیتی ہے۔ اور جب ہاکی نے مختار صدیقی کو چھوڑ دیا تو انھوں نے شاعری کا دامن تھاما۔ مگر شاعری ہاکی نباشد۔ ہاکی آدمی کو چھوڑ دیتی ہے، شاعری ایک دفعہ آدمی کو پکڑ لے پھر جان نہیں چھوڑتی۔ مختار صدیقی شاعری کی فیلڈ میں ہنوز موجود ہیں۔

سفر، بیماری، شاعری۔ یہ مختار صدیقی کا خلاصہ ہے۔ اگرچہ نصیر انور نے ان کے کچھ اور اوصاف بھی بیان کیے۔ پاکستان کونسل میں اب تک مصوروں کی رونمائی کی رسم ادا ہوئی تھی اس بار ایک شاعر کی رونمائی ہوئی۔ نصیر انور کا کہنا یہ تھا کہ مختار صدیقی کو نرا شاعر مت جانو۔ اس شخص کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ کبھی اس نے اپنا سارا زور پہلوانی پہ صرف کیا، کبھی ہاکی پر جان دی، کبھی تاریخ کی شناوری کی اور کبھی تصوف کے بحرِ ذخار میں غوطے لگائے۔ مگر مختار صدیقی نے اپنی زندگی کا نقشہ اور ہی طرح پیش کیا۔ ؎

بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ہوئی اور مر گئے

اُردو کے مطالعہ میں جو باتیں حارج ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اُردو شعر و افسانہ پر معقول تنقید موجود نہیں ہے۔ رسل صاحب بتاتے ہیں کہ چونکہ ازمنۂ وسطیٰ میں غزل سے ملتی جلتی شاعری یورپ میں ہو چکی ہے۔ اور اس پر کتابیں موجود ہیں۔ اس لئے ان کتابوں کو حوالہ بنا کر لندن یونیورسٹی کے طلبا غزل کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اُردو کے مطالعہ میں بھی لندن لاہور سے چار قدم آگے ہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں اُردو فکشن کی تاریخ پریم چند کے عہد پر تمام ہو جاتی ہے۔ لندن یونیورسٹی کے اُردو کے نصاب میں ۴۵ء کے بعد کا افسانہ بھی شامل ہے۔ یعنی اُردو افسانہ پریم چند کی فصیل کو پھاند کر کرشن چندر اور عصمت چغتائی تک آ گیا ہے۔

(۲۲ مئی ۶۵ء)

بیماری اور شاعری

آدمی ہاکی کو نہیں چھوڑتا، ہاکی آدمی کو چھوڑ دیتی ہے۔ اور جب ہاکی نے مختار صدیقی کو چھوڑ دیا تو انھوں نے شاعری کا دامن تھاما۔ مگر شاعری ہاکی نباشد۔ ہاکی آدمی کو چھوڑ دیتی ہے، شاعری ایک دفعہ آدمی کو پکڑ لے پھر جان نہیں چھوڑتی۔ مختار صدیقی شاعری کی فیلڈ میں ہنوز موجود ہیں۔

سفر، بیماری، شاعری۔ یہ مختار صدیقی کا خلاصہ ہے۔ اگرچہ نصیر انور نے ان کے کچھ اور اوصاف بھی بیان کیے۔ پاکستان کونسل میں اب تک مصوروں کی رونمائی کی رسم ادا ہوئی تھی اس بار ایک شاعر کی رونمائی ہوئی۔ نصیر انور کا کہنا یہ تھا کہ مختار صدیقی کو نرا شاعر مت جانو۔ اس شخص کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ کبھی اس نے اپنا سارا زور پیلرائی پہ صرف کیا، کبھی ہاکی پر جان دی، کبھی تاریخ کی شناوری کی اور کبھی تصوف کے بحرِ ذخار میں غوطے لگائے۔ مگر مختار صدیقی نے اپنی زندگی کا نقشہ اور ہی طرح پیش کیا۔ ع

بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ہوئی اور مر گئے

معمولی درجہ کے آدمی کی زندگی تو یہی ہوتی ہے اور مختار صدیقی نے ایک معمولی درجہ کا آدمی اپنے آپ کو قرار دے کر بی اے پاس کرنے کے وقت سے اپنی زندگی کا قصہ شروع کیا۔

اِس قصہ میں نہ پہلوانی کا ذکر تھا نہ ہاکی کا نہ عشق کا۔ کسی نے سوال کیا کہ تھوڑا تذکرہ بچپن کا کیا ہوتا کہ پتہ چلتا کہ کون سے اثرات تھے جنہوں نے آگے چل کر آپ کو شاعر بنایا۔ مگر مختار صدیقی کو شاید اپنا بچپن کچھ بہت زیادہ یاد نہیں۔ سو انھوں نے اس سوال پر زیادہ گفتگو نہیں کی پھر کسی نے پوچھا کہ اچھا صاحب یہ بتایئے کہ آپ نے ہاکی چھوڑ کر شاعری کی طرف آنے کی زحمت کیسے کی۔ اس پر مختار صدیقی نے یہ عبرت انگیز بات کہی کہ آدمی ہاکی کو نہیں چھوڑتا۔ ہاکی آدمی کو چھوڑ دیتی ہے۔

شاید کچھ نوجوان اس تقریب میں یہ سوچ کر آئے تھے کہ یہ شاعر کے اعزاز میں تقریب ہے اور شاعر اس کے سوا کیا کرے گا کہ حالِ دل سنائے گا۔ اور زلفِ یار کی باتیں کرے گا۔ جب ساری رام کہانی ہو چکی اور ذکرِ بتاں نہ ہوا تو ایک نوجوان سخت مایوس ہوا۔ اس نے تقاضا کیا کہ جناب آپ شاعر ہیں کچھ لب و رخسار اور زلفِ یار کا قصہ بھی تو سنایئے مگر اس خشک مزاج شاعر نے یہ کہہ کر اس پر اوس ڈال دی کہ ایسی کوئی داستان اس کی ذات سے وابستہ نہیں اور یہ کہ شاعر ایسی فضول باتیں شعر میں ضرور کرتے ہیں مگر واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مختار صدیقی نے بیماریٔ دل کا ذکر تو نہیں کیا مگر جسمانی بیماری کا ذکر بہت کیا۔ انھوں نے بیماری کا احوال ایسے سنایا جیسے دل زدہ شاعر اپنے دل کا دکھ بیان کرتے ہیں۔ بیماری ایچھی آئی کہ ان کے احساس کو روگ لگ گئی۔ اس بیماری میں ان پر یہ منکشف ہوا کہ آدمی جیتے جی لاچار اور بے بس بھی ہو سکتا ہے۔ اس احساس نے انھیں بہت کھایا۔ اگر موت ہی آنی ہے تو حرکتِ قلب بند ہو جائے اور موت آ جائے۔ آخر آدمی چارپائی پر پڑا ایڑیاں کیوں رگڑے اور گھل گھل کر اور سسک سسک کر کیوں مرے۔ کیا قدرت کا مقصود یہ ہے کہ اس سے آدمی عبرت حاصل کرے مگر عبرت کا مرقع بننے کے لئے عمارت کا شاندار ہونا اور آدمی کا بڑا ہونا ضروری ہے۔ یوں تو بہت سے چھوٹے موٹے مکان اور چھوٹے موٹے آدمی کھنڈر بن جاتے ہیں۔ مگر وہ تو مرقعٔ عبرت نہیں بنتے۔ ہاں جب شاندار عمارت کھنڈر بنتی ہے تو عبرت کا مرقع بنتی ہے۔ اور بڑا آدمی جب گرتا ہے تو عبرت کا مرقع بنتا ہے۔ چھوٹا آدمی گر کر خود اپنے ہی لئے عبرت بن سکتا ہے۔ مگر اس کے لئے لازم ہے کہ وہ زندہ رہے۔ مختار صدیقی نے یہ منطق وضع کی اور اپنے جینے کا جواز پیدا کیا۔ اس منطق نے ایک کامیاب نسخہ کا کام کیا کہ مختار صدیقی جی اٹھے۔ انھوں نے اپنی بیماری سے عبرت حاصل کی ہو یا نہ کی ہو، بہرحال شاعری کے لئے مواد ضرور حاصل کیا۔ یہ بیماری ان کے لئے ایک واردات ٹھہری اور ان کی شاعری میں سرایت کر گئی۔

مختار صدیقی کے پاؤں میں چکر ہے۔ مگر بال بچوں میں پھنس کر وہ اپنی ساری

آوارگی بھول گئے۔ اب کبھی کبھی یہ ہڑک اُٹھتی ہے کہ گھر سے نکلو اور چل پڑو۔ مگر بیوی کے ڈر سے وہ اپنے دل کو مار لیتے ہیں اور کسی سے اس کا ذکر نہیں کرتے۔ نگران کا بیان ہے کہ یہ آوارہ طبعی انھیں جوانی میں شہر شہر لئے پھری۔ اسی واسطے سے اُنھوں نے برِّعظیم میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے تہذیبی ورثے سے شناسائی حاصل کی۔ دِلّی، آگرہ، فتح پور سیکری، روہیل کھنڈ، بندیلکھنڈ، دکن۔ ان شہروں اور علاقوں میں وہ گھومے پھرے اور مغلوں اور مغلوں سے پہلے کے افغانوں کی عمارتوں کو دیکھا بھالا اور اپنے تہذیبی شعور کی تربیت کی۔

مگر پھر پاکستان بن گیا اور اُنھوں نے سوچا کہ مسلمانوں کی تہذیب کے نشانات تو سرحد کے اس طرف رہ گئے۔ پھر مختلف تقریبوں سے وہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں گھومے پھرے۔ یہاں بکھرے ہوئے تہذیبی آثار دیکھے اور اس سوال سے دوچار ہوئے کہ کون کون سے تہذیبی آثار کس کس طور پر پاکستان کے مسلمانوں کی تہذیب کا حصّہ ہیں۔

مختار صدیقی نے اپنی اس تقریر میں ان مختلف فکری تحریکوں کا بھی ذکر کیا جو تقسیم سے پہلے ان کے اِردگرد پھل پھول رہی تھیں اور انھوں نے یہ کہا کہ اس وقت بہت سے ادیبوں نے تقسیم کو ایک المیہ سمجھا مگر انھوں نے ایسا نہیں سمجھا۔ تقسیم کو انھوں نے تاریخ کے ایک اٹل فیصلہ کی حیثیت سے تسلیم کیا اور ادب کی اس ترقی پسند سے الگ تھلگ رہے جس میں کلچر کی تقسیم پر آنسو بہائے جاتے تھے۔

(۲۹/۷/۶۵)

لتا منگیشکر کی واپسی

غالب نے عجب شعر کہا ہے۔

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

پھر وہی بے وفا لتا منگیشکر ہے اور پھر وہی ہم ہیں اور پھر وہی ریڈیو جالندھر اور پھر وہی چائے کی دکان پر فرمائشیں سننے والے اور پھر وہی پرانے اشتہار اور پھر وہی سنتوش کمار۔ پندار کا صنم کدہ ویراں ہے اور ہم اپنی روش پر واپس آرہے ہیں۔

وہ ۶ ستمبر تھی جب لتا منگیشکر نے ہم سے بے وفائی کی۔ اور ہم نے اس کا ذکر سے کنارا کیا۔ پھر اٹھارہ دن گزر گئے اور وہ آواز سننے میں نہ آئی۔ مگر انیسویں دن مزنگ چونگی سے گزرتے گزرتے یہ آواز ہمارے کان میں پڑی۔ ہم چونکے۔ مگر ابھی ہم نے سنبھالا لیا تھا کہ پنواڑی نے سوئچ گھمایا اور سوئی پھر لاہور ریلوے سٹیشن پر آ گئی اور جنگی ترانہ ہونے لگا۔

پھر دن گزرتے گئے پنواڑیوں کی دکانوں اور چائے خانوں میں ریڈیو پاکستان کی آواز لشتم پشتم گونجتی رہی. کوئی پنواڑی بے اطمینان ہو کر سوئچ گھماتا. کبھی ریڈیو سیلون لگاتا، کبھی جالندھر ریڈیو سے ملاتا. مگر کوئی تن جلا طنزیہ سوال کرتا "استاد جالندھر لگا رکھا ہے" اور پنواڑی جھینپ کر سوئی کو پھر اپنے سٹیشن پر لے آتا. رفتہ رفتہ طنزیہ لہجہ اور جھینپ دونوں رخصت ہو گئیں. اب پھر چھوٹے چائے خانوں میں یار لوگ چائے کی پیالی کے ساتھ فرمائش کا آرڈر دیتے ہیں اور ریڈیو سیلون سے ریڈیو جالندھر تک کے فرمائشی پروگرام سنتے ہیں، لتا منگیشکر پھر کتنی مقبول ہو چکی ہے. اور ؎

کل لڑائی سی لڑائی ہو چکی

اور ہم پھر مال روڈ کے اس چائے خانہ میں جہاں انگریزی ریکارڈوں کے ساتھ چند اردو کے ریکارڈ بھی ہیں یہ ریکارڈ ذوق و شوق سے سنتے ہیں:

کنکریا مارے کر کے اشارے

بلما بڑا بے ایمان

لاہور ریڈیو سٹیشن جہاں تھا اب پھر وہیں ہے. اور ہم نے دوستوں سے کہا کہ یارو یہ کیا بات ہے کہ جنگ کے دنوں میں تو نہیں لاہور سٹیشن سنے بغیر کل نہیں پڑتی تھی، جنگ کا زمانہ رخصت ہوا تو تم نے اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا ہے.

جنگ کا ایک اثر یہ ہوا تھا کہ آوارہ رُوحیں اپنی اپنی جُون میں واپس آ گئی تھیں۔ اور تو اور سنتوش کمار نے بھی اعلان کر ڈالا کہ اب لوگ مجھے سنتوش کمار نہ کہیں موسیٰ رضا کہیں۔ سنتوش کمار نے چینو سے موسیٰ رضا بن کر اپنا نام روشن کیا۔ کسی فلم کے اشتہار میں ان کا نام آتا تو یوں لکھا جاتا موسیٰ رضا (سنتوش کمار) مگر اب جو ان کی فلموں کے اشتہار آ رہے ہیں وہ بریکٹ کے جھنجھٹ سے آزاد ہیں موسیٰ رضا غائب ہوئے اب پھر سنتوش کمار کے نام کی دھوم ہے۔

اور قصہ شادی بیاہ کا یوں ہے کہ جنگ بہت سی شادیوں کو لے بیٹھی۔ بعض شادیاں کچھ اس طرح ملتوی ہوئیں کہ بس ملتوی ہی ہو گئیں۔ بعض عاقبت اندیشوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور جنگ کے پردے میں جہیز، بری اور ولیمہ قسم کے سارے جھمیلوں کے بغیر سیدھی سادی جنگی شادی کر ڈالی۔ اور ایک ادیب دوست نے ہمارے کان میں کہا کہ یار میں تو سچ مچ شادی کرنے لگا تھا۔ مگر خیر جنگ چھڑ گئی اور جنگ دیکھئے کب تک چلے۔ تو شادی کو ہم نے سلام کیا۔

مگر پھر فائر بندی ہو گئی۔ اور اللہ بھلا کرے ہمارے ایک انگریزی اخبار نویس دوست کا کہ فائر بندی کے دن بہت بپھرے بپھرے پھر رہے تھے۔ مگر تیسرے دن ہم نے دیکھا کہ انھوں نے ٹکٹ کٹایا اور کراچی چلے گئے۔ وہاں جا کر انھوں نے اپنی معطل منگنی کی تجدید کی اور شادی کر لائے۔

یہ ماجرا دیکھ کر ہمارے ادیب دوست نے جھرجھری لی اور سوچا کہ جنگ

تو واقعی ختم ہوگئی ہے۔ لاؤ شادی ہی کرلیں۔ سو اُنھوں نے اٹھ کر ایک پھیرا کراچی تک کا لگایا اور واپس آکر دو معتبر پروفیسروں اور ڈھائی تین ادیبوں کو لے کر ایک دروازے پر دستک دی اور جھٹ پٹ نکاح پڑھوا لیا۔ پھر ایک دانشور راولپنڈی سے اچانک لاہور پہنچا اور نکاح کے دو بول پڑھوا کر واپس پنڈی چلا گیا۔ اور نکاح بیاہ کی رَو ایسی آئی ہے کہ جنگ سے پہلے احباب جن کے لئے دعائے خیر کر چکے تھے ان کے بھی ہاتھ پیلے ہوگئے۔

تو پھر وہی زندگی کے قصّے۔ وہی شادیاں خانہ آبادیاں۔ وہی فلمی ریکارڈوں کی فرمائشیں۔ وہی لتا منگیشکر وہی ہم۔ ؎

پھر اسی بیوفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

(۲/۲/۶۶)

بادلوں کے سُر اور موسیقی کے سُر

بسنت کے بادل جمعرات کو واپس آئے اور پیاسی زمین کے کلیجے میں تھوڑی سی ٹھنڈک پیدا کر گئے۔ ان بادلوں کو تو برستے ہوئے ایک خلقت نے دیکھا مگر تھوڑے لوگ ایک اور واقعہ کے بھی شاہد ہیں۔

روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ جمعرات کا دن تھا اور ٹیلی ویژن سٹیشن کے ایک گوشے میں ریہرسل جاری تھی۔ امانت علی خاں نے گوڑ سارنگ راگ شروع کر رکھا تھا اور بارش کی دعا ان کے ہونٹوں پر تھی۔ ؎

اے داتا بادل برسا دے
فصلوں کا پرچم لہرا دے

دیس کی دولت دیس کے پیارے
سوکھ رہے ہیں کھیت ہمارے
ان کھیتوں کی پیاس بجھا دے اے داتا بادل برسا دے

بارش کی دعا شروع تھی اور باہر بادل امنڈ گھمنڈ کر آ رہے تھے اور پھوار پڑنے لگی تھی۔ رات کو آٹھ بج کر چالیس منٹ پر ٹیلیویژن پر اعلان کرنے والی خاتون نے اعلان کیا کہ امانت علی اب گوڑ سارنگ راگ چھیڑتے ہیں اور بارش کی دعا کرتے ہیں۔ آؤ ہم سب مل کر دعا کریں کہ فن کار کی دعا قبول ہو۔

راگی کا راگ رنگ لایا۔ جب یہ راگ ختم ہو رہا تھا تو باہر اچھی خاصی بارش ہو رہی تھی اور پیاسی زمین شاداب ہو رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ امانت علی خاں کے قدر دانوں نے انھیں طعنہ دیا تھا اور کہا تھا کہ اگلے زمانے میں موسیقار راگ گاتے تھے اور رِم جھم بارش ہونے لگتی تھی۔ تم کیسے موسیقار ہو کہ دیس کی زمین پیاسی ہے، کھیت خشک ہیں اور تم بیٹھے دیکھتے ہو۔ تم بھی بے اثر، تمہارا راگ بھی بے اثر۔

امانت علی خاں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ ہماری زبان سمجھتا ہے۔ ہماری زبان سُر ہیں۔ اور میں جمعرات کو ناصر کاظمی کی لکھی ہوئی بارش کی دعا ٹیلیویژن پر گاؤں گا۔ کیا عجب ہے کہ دعا سُنی جائے۔

سنیچر کے دن اوپر کالی گھٹا امنڈ رہی تھی اور امانت علی خاں کہہ رہے تھے کہ باری تعالیٰ موسیقار کی آواز سُنتا ہے۔

ناصر کاظمی نے ٹکڑا لگایا کہ "اور شاعر کی آواز بھی"

شاعر کی آواز باری تعالےٰ کیسے سنتا ہے اس کا بارِ ثبوت موسیقار نے

شاعر پر چھوڑ دیا۔ اپنی بات کی وضاحت اُس نے یوں کی کہ بات یہ ہے کہ بادلوں کے بھی سُر ہوتے ہیں۔ فضا میں اگر وہ سُر چھوڑے جائیں جو بادلوں کے سُر ہیں تو بادل گھر آتے ہیں اور برستے ہیں۔ بس سُر سے سُر ملنے کی بات ہے۔

سُر سے سُر ملنے کی ایک مثال امانت علی خاں نے یہ پیش کی کہ اگلے زمانے میں جل کیدارا سُنا کر بخار کا علاج کیا جاتا تھا۔

مگر ناصر کاظمی کا استدلال یہ تھا کہ شاعر اور موسیقار موسموں کے مُخبر ہوتے ہیں۔

جمعرات کی پھوار دیکھ کر ایک خوش فہم نے کہا تھا کہ مینہ کھل کر تو نہیں برسا مگر خیر کوئی بات نہیں۔ یہ مت بھولو کہ یہ جمعرات کا دن ہے اور جمعرات کو جب بارش ہوتی ہے تو پھر جھڑی لگتی ہے اور جمعرات ہی کو جا کر ختم ہوتی ہے۔

ہم نے اس بات کو سنا اور چادر تان کر سوئے۔ ہم نے طے کر لیا تھا کہ بادل جمعرات کی جھڑی کی رسم ضرور نبھائیں گے۔ مگر یارو ستم ہے کہ زمانے سے وضعداری بالکل ہی اُٹھ گئی۔ آگے آدمی اور بادل دونوں وضعدار ہوا کرتے تھے۔ اس بے وضع زمانے میں آدمیوں کی دیکھا دیکھی بادل بھی بے وضع ہو گئے۔ جمعہ کو ایک بوند نہیں پڑی۔ نہ بجلی ہی کڑکی اور نہ بارش ہوئی۔ پھر وہی صاف آسمان اور پھر وہی بے داغ دھوپ۔

مگر ایک دوست نے یہ کہا کہ بات یہ ہے کہ محکمۂ موسمیات نے جمعہ کی بارش کی پیشگوئی کی تھی۔ اس پیشگوئی نے امانت علی خاں کے راگ کا بھی اثر زائل کیا اور جمعرات کی جھڑی کی رسم میں بھی کھنڈت ڈالی۔

یہ سُن کر ہم نے سوچا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ محکمۂ موسمیات اور بادلوں کی آویزش میں عزیب خلقِ خدا پِس رہی ہے۔ فروری کے مہینے میں محکمۂ موسمیات نے بار بار بارش کی پیشگوئی کی۔ کبھی پھوار کا مژدۂ جانفزا سنایا۔ کبھی طوفانِ برق و باراں کی خبر دی۔ کبھی ہلکی پھلکی بارش کی افواہ اڑائی۔ مگر بارش نے محکمہ کے ہر وار کو خالی دیا۔ اور جب سنیچر کو محکمہ نے صرف جزوی ابر کی پیش گوئی کی تو گھٹا دن بھر امنڈی رہی اور تھوڑی سی بوندیں بھی پڑ گئیں۔

ناصر کاظمی نے صحیح کہا کہ شاعر اور موسیقار موسموں کے مخبر ہوتے ہیں۔ مگر موسموں کی کچھ خبر پرندوں کو بھی ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ابھی تو فروری ہے۔ یہ فاختہ نے کیوں بولنا شروع کر دیا ہے۔ فاختہ جب بولتی ہے تو ہمارا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ یہ آواز ہم سے یوں کہتی ہے کہ بسنت گئی، گلابی جاڑا ابھی گیا سمجھو، جاڑا جاتا ہے گرمی آتی ہے۔ امانت علی خان کہاں ہیں۔ کیا ان کے گلے میں کوئی ایسا سُر بھی ہے جو فاختہ کو چند سے خاموش رکھے۔ بوندیں ضرور برسی ہیں مگر دیس کی زمین ہنوز پیاسی ہے اور کھیت ہنوز تشنہ لب ہیں۔ ؎

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم ... بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

تو شاعر کے کلام اور مغنی کے راگ میں ابھی اور اثر چاہیے۔ شاید بادل کے سُر، راگی کا راگ اور شاعر کے لفظ ابھی آپس میں پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہوئے۔

(۲۰-۲/۴۴)

محکمۂ موسمیات ہمارے اندر ہے

ایک مراسلہ پڑھیے:

"آپ نے روایت بیان کی ہے، بارش امانت علی خاں کے راگ گوڑ سارنگ کے الاپ کے اثر سے ہوئی ہے:

ناصر کاظمی کا خیال ہے کہ بارش ان کے گیت کی تاثیر سے ہوئی ہے۔ مائی رکھی کہتی ہے۔ کالی کُتیا نے بچے دیئے، میں نے اسے پراٹھا کھلایا، اور خدا سے دُعا مانگی۔ بارش اس دعا کے اثر سے ہوئی ہے۔ جماعت اسلامی مطمئن ہے بارش اس کی دعا کے اثر سے ہوئی ہے۔ ایک کنجنی بتاتی ہے۔ میرے کوٹھے پر ایک عادی چور کسی یتیم کا مال چرا کر آگیا تھا میں نے اُسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ بارش کے لئے دعا میری قبول ہوئی ہے۔"

میں سوچتا ہوں۔ امانت علی خاں۔ جماعت اسلامی۔ ناصر کاظمی۔ مائی رکھی۔ ایک کنجنی، اپنی اپنی جگہ سب درست سوچ رہے ہیں لیکن خدا بہتر جانتا ہے۔

کہ بارش کس کی دعا کے اثر سے ہوئی ہے. ممکن ہے اس سراپا رحمت کے دربار میں ان میں سے کسی کا نام بھی شمار نہ کیا گیا ہو۔ (بابا عالم سیاہ پوش)

بیابابا عالم سیاہ پوش نے بارش کے بہت سے مدعیوں کے نام گنانے کے باوجود کچھ مدعیوں کے نام چھوڑ دیئے ہیں. مثلاً لاہور کالج برائے خواتین کی لڑکیوں کا دعوے کہ بارش ان کی دعا سے ہوئی تھی. جب یہ لڑکیاں لاہور سٹیڈیم میں قلانچیں بھر رہی تھیں تو انھوں نے دوپٹہ پھیلا کر دعا مانگی تھی کہ "اے اللہ چاہے ہم بھیگ جائیں اور چاہے ہمارا کھیل بند ہو جائے مگر بارش ضرور ہو" اور اللہ میاں نے دعا اس طرح قبول کی کہ زقندیں بھرتی ہوئی لڑکیوں کی زقندوں میں بھی کھنڈت نہیں پڑی اور بارش بھی ہو گئی۔

ایک جلسہ میں بارش مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے ایک معزز مہمان سے منسوب کی گئی. کہا گیا کہ جسٹس مرشد بارش اپنے ساتھ لائے ہیں.

ایک بچہ ہم سے کہتا تھا کہ "ہمارے ماسٹر صاحب کی دعا سے بارش ہوئی ہے"

ہم نے پوچھا کہ "تمہیں یہ کس نے بتایا"

کہنے لگا کہ "ماسٹر صاحب کلاس میں کہہ رہے تھے کہ دیکھو آج ہی میں نے بارش کی دعا مانگی تھی اور آج ہی بارش ہو گئی"

بہرحال امانت علی خاں اور ناصر کاظمی کا دعویٰ اپنی جگہ پر قائم ہے۔

امانت علی خاں کا دعویٰ ہے کہ وہ اس سے پہلے بھی دو مرتبہ اپنے راگ کے اثر سے بارش کرا چکے ہیں۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے شادی کی ایک محفل میں کھلے آسمان کے نیچے میگھ ملہار گایا اور دیکھتے دیکھتے اتنی بارش ہوئی کہ ساری بارات بھیگ گئی۔

ناصر کاظمی کہتے ہیں کہ "اصل میں شاعری ہے ہی بارش کی دعا۔ شاعری ہمارے اندر بارش کرتی ہے اور باہر جب بارش نہیں ہوتی تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارے اندر بارش کا سلسلہ بند ہوتا ہے اور ہمارے ذہن بنجر ہوتے ہیں۔"

مگر ناصر کاظمی اس استدلال پر قناعت نہیں کرتے کیونکہ اس طرح تو اور شاعر بھی بارش کی دعا میں ان کے حصہ دار ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ اس دادا کے پوتے ہیں جس کی دعا سے بادل گھر کر آتے ہیں اور موسلا دھار برستے ہیں۔ اور ایک دفعہ ان کے دادا کو غصہ آیا تھا تو زلزلہ آگیا تھا۔

بابا عالم سیاہ پوش کی زبان میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اپنی اپنی جگہ یہ سب درست سوچ رہے ہیں لیکن خود یہ مدعی اس صورت حال کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ بھلا جماعت اسلامی کیسے مان لے گی کہ امانت علی خاں کے راگ نے بارش کرائی ہے۔ اور امانت علی خاں کیوں مانیں گے کہ سُر کی زبان سے انکار کرنے والی جماعت اسلامی کی دعا میں تاثیر ہو سکتی ہے۔

مگر بابا سیاہ پوش کو اس سے کیا مطلب اور ہمیں اس سے کیا مطلب ہے۔ ہمیں آم کھانے سے مطلب ہے نہ کہ پیڑ گننے سے اصل بات یہ ہے کہ بارش

ہو گئی۔

البتہ ایک بات ہے۔ بابا عالم سیاہ پوش دعا مانگنے والوں کے دعووں پر بے شک شک کریں اور بے شک کہیں کہ "ممکن ہے اس سراپا رحمت کے دربار میں ان میں سے کسی کا نام بھی شمار نہ کیا گیا ہو۔" بس اتنی گذارش ہے کہ بنفسہ دعا کی قدر سے انکار نہ کریں۔

صورت احوال یہ ہے کہ فطرت سے ہمارا رشتہ وجدانی ہے سائنسی نہیں ہے۔ شاید اسی لئے محکمۂ موسمیات کی پیش گوئیاں ہمیں زیادہ پریشان نہیں کرتیں۔ لندن میں محکمۂ موسمیات غلط پیش گوئیاں کرے تو وہاں والوں کے لئے ایک مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارے یہاں اس محکمہ کی پیش گوئیاں غلط ثابت ہوتی رہتی ہیں اور ہمارے لئے اس سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ ہمارا محکمۂ موسمیات تو ہمارے اندر قائم ہے۔ سب موسموں کی خبریں وہیں سے آتی ہیں۔

جب بارش نہیں ہوتی یا جب بارش سیلاب کی صورت اختیار کر جاتی ہے تو ہم فطرت سے اپنے دیرینہ باطنی رشتے کو بروئے کار لاتے ہیں۔ اس رشتے میں دوستیاں بھی ہوتی ہیں اور دشمنیاں بھی چلتی ہیں۔ ایک فلک کج رفتار ہے جس سے کیا عاشق اور کیا شاعر سب شاکی چلے آتے ہیں۔ مگر بادلوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ بس کبھی کبھی وہ روٹھ جاتے ہیں۔ اور موسیقار یہ کہتے ہیں کہ انھیں منانے کی کنجی ہمارے پاس ہے۔

دُولہاؤں سے ایک انٹرویو

ذی الحجہ کا مہینہ تمام ہوتا ہے یعنی ہمارا آپ کا پُرانا سال پُورا ہوا۔ اَب نئے برس کی تیاریاں ہیں بگر نہ اس طرح جس طرح عیسوی سن میں نئے برس کی تیاریاں ہوتی ہیں۔ یہاں رنگ اور ہے۔ غم کی رسم کے انتظامات ہیں خوشی کی رسموں کو سمیٹا جا رہا ہے۔ اس برس ان کا سمیٹنا کچھ زیادہ ہی مشکل نظر آ رہا ہے۔ ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

آخری شادی کل ۲۸ر ذی الحجہ کو ہوئی۔ اگر ۲۹ر کے چاند کا دھڑکا نہ ہوتا تو آج بھی شادی ہوتی۔ کل رات گئے ایک درزی نے دکان بند کرتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا اور کہا کہ اس برس تو سب ہی نپٹ گئے۔ اب شہر میں کیا کوئی کنوارا رہا ہوگا اور کیوں کوئی کنواری بچی ہوگی۔

شادیوں کی بہتات کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ میں ایک کردار ازراہ سے

پایا جانے لگا ہے۔ آگے ہزاروں میں کوئی ایک جیالا نوشہ میاں ہوا کرتا تھا۔ اب شہر کی جس گلی سے گذریئے تو ہر تیسرا نوجوان دولہا نظر آتا ہے۔

ایک دولہا سے ہم نے پوچھا کہ "اے نوجوان بتا تو نے شادی کو کیسا پایا"۔

اُس نے ایک احساس آسودگی کے ساتھ جواب دیا کہ "خدا کی قسم میں نے شادی کو بہت اچھا پایا۔ میرا ہاضمہ بہت اچھا ہو گیا ہے۔ میں ایک وقت کھانا کھاتا تھا۔ بس ایک روٹی کھاتا تھا۔ اب میں دونوں وقت ڈٹ کر کھانا کھاتا ہوں"۔

ایک پکی عمر والے دولہا سے ہم نے سوال کیا کہ ایک عمر گذارنے کے بعد آپ نے شادی کی ہے۔ آپ کی زندگی میں اب بہت فرق پڑ گیا ہے۔

اُس مردِ خدا نے جواب دیا۔ "کوئی ایسا فرق نہیں پڑا۔ ہاں یہ ہے کہ صبح دفتر میں ذرا دیر سے پہنچ رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ سالہا سال سے اپنا یہ طور چلا آ رہا تھا کہ اکیلے بیٹھ کر جلدی جلدی ناشتہ کیا اور دفتر چل پڑا۔ اسی عادت کے مطابق میں اکیلا ناشتہ کی میز پر بیٹھ جاتا ہوں۔ ناشتہ کر کے دفتر چل پڑتا ہوں۔ رستہ میں مجھے یاد آتا ہے کہ اصل میں مجھے بیوی کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرنا چاہیئے تھا۔ میں گھر واپس آتا ہوں اور اس سے معذرت کرتا ہوں۔ بس اس میں دیر ہو جاتی ہے"۔

ایک اخبار نویس دولہا سے ہم نے سوال کیا کہ شادی کے بعد تم نے اپنی زندگی میں کیا فرق پایا؟

اس نے جواب دیا کہ "یار بات یہ ہے کہ میں پہلے ناشتہ کی میز پر بیٹھ کر

اخبار پڑھا کرتا تھا۔ اب ناشتہ کی میز پر بیوی بھی ہوتی ہے۔ اور اخبار بھی ہوتا ہے اور ایک نیام میں دو تلواریں تو نہیں سما سکتیں۔ سو بیوی ہی بیوی رہ گئی۔ ناشتہ کی میز سے اخبار غائب ہو گیا۔

ایک دولہا نے اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ "یار اگر سسرال نہ ہو تو شادی بہت اچھی چیز ہے۔"

ہم نے ایک دولہا کو دیکھا جو اپنے دوست کو شادی کا مشورہ دے رہا تھا۔ مگر یہ دوست شادی سے بہت خائف تھا۔ اس نے جواب دیا: "یار مجھے سو طرح کی بیماریاں ہیں۔ میں کیا شادی کروں۔"

اس پر ایک دوست نے کہ شادی کے سب مزے چکھ چکا ہے۔ کہا کہ "کوئی ہرج نہیں تم شادی کر لو، بڑی بیماری چھوٹی بیماریوں کو کھا جاتی ہے۔ شادی سو بیماریوں کی ایک بیماری اور سو علاجوں کا ایک علاج ہے۔"

ایک پروفیسر کی بارات میں ایک پرنسپل بھی شامل تھے کسی نے ان سے کہا کہ "اپنے اس تو خیز ہم پیشہ کو کچھ مشورہ دو۔"

پرنسپل صاحب نے اپنے سفید سر پر ہاتھ پھیرا۔ "بات یہ ہے کہ میں اپنے اس عزیز کو وہ مشورہ نہیں دینا چاہتا جو میرے پرنسپل نے مجھے دیا تھا۔"

پرنسپل صاحب بولے کہ "ڈاکٹر تاثیر مرحوم میرے پرنسپل تھے۔ جب میں نے سہرا باندھا اور گھوڑی پر سوار ہوا تو تاثیر صاحب میرے قریب آئے اور کان میں

کہا۔ ”ابھی موقعہ ہے بھاگ سکتا ہے تو بھاگ جا“

مگر بارات کی گھوڑی کی سواری شیر کی سواری ہے۔ جو اس پر سوار ہو گیا سو سوار ہو گیا۔ بہر حال ایک گرم و سرد چشیدہ شوہر کے قول کے مطابق تاثیر صاحب نے شادی کے متعلق آخری اور حتمی بات کہہ دی ہے۔

ایک دولہا سے ہم نے پوچھا کہ استاد تم نے تو شادی نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ تم زیرِ دام کیسے آئے۔

اُس نے جواب دیا کہ شادی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آدمی کے کئی چھوٹے بھائی ہوں۔ جب لوگ اس سے شادی کا زیادہ تقاضا کریں تو وہ کسی ایک بھائی کی شادی کر لے اور اپنے لئے مہلت حاصل کر لے۔ اپنا کوئی چھوٹا بھائی تھا ہی نہیں مہلت کیسے ملتی اور کتنی ملتی۔

(۲۴ ۲/۶۶)

مولانا حسرت موہانی کے بارے میں

لگتا ہے کہ بی این آر اڈیٹوریم میں یوم منانے والے آجکل سستا رہے ہیں۔ میرے یاروں نے بڑے بڑے یوم کو یوں گزار دیا جیسے وہ آیا ہی نہیں تھا۔ یوم ٹیپو سلطان شہید، یوم سید احمد شہید، یوم جنگِ آزادی، یوم حسرت موہانی غرض ہر یوم کو انھوں نے خالی دیا۔ اور ہماری سادگی دیکھو کہ ہر یوم آنے پر ہم نے سوچا کہ اس مرتبہ ضرور بی این آر میں جلسہ ہوگا۔ اس امید میں وہاں پہنچے اور دیکھا کہ ہال ہُو حق کرتا ہے۔

یوم منانے والوں کی ستم ظریفی دیکھو کہ جب یوم منانے پر آتے ہیں تو غریب سہارنپوری تک کا یوم منا ڈالتے ہیں۔ جب نظر انداز کرنے پر تُلتے ہیں تو حسرت موہانی تک کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور حسرت موہانی تو دوہری شخصیت کے مالک تھے یعنی قومی رہنما بھی تھے اور شاعر بھی تھے۔ مگر اس بزرگ کے بختِ نارسا کو دیکھو کہ قومی شخصیتوں کا جاد بے جا نام لینے والوں نے بھی اس کی یاد میں جلسہ نہیں کیا۔ اور مشاعرہ کرنے

والوں نے کہ مشاعرہ کرنے کا بہانہ ٹٹولتے رہتے ہیں، اس کی یاد میں مشاعرہ نہیں کیا۔

حسرت موہانی کی مصروفیتیں دو تھیں۔ جیل جانا اور غزل لکھنا۔ ویسے اس بزرگ کے یہاں سیاست اور شاعری شعور کے دو الگ الگ منطقے تھے۔ غزل کا اپنا رنگ تھا۔ سیاسی سرگرمی کا اپنا رنگ تھا۔ ہاں ان دو رنگوں کے درمیان ایک شے مشترک تھی۔ وہ تھی اس شخص کی متشددانہ دیانت داری، اس رویّے کا پورا اظہار آپ ان کی سیاسی زندگی میں بھی دیکھ لیجیے اور ان کی غزل میں بھی دیکھ لیجیے۔ اس رویئے کے واسطے سے دونوں کے درمیان آپس میں ایک ربط ہے۔

سیاستدان حسرت موہانی کی مت پوچھو۔ جب گاندھی جی صرف درجۂ نوآبادیات کی بات کر رہے تھے اس شخص نے مکمل آزادی کا نعرہ بلند کیا۔ تحریکِ آزادی میں حسرت موہانی پہلے آدمی ہیں جنھوں نے یہ نعرہ بلند کیا۔ کانگریس کے احمد آباد والے اجلاس میں سب ہی نامی گرامی رہنما جمع تھے مگر ان کا سیاسی شعور ابھی درجۂ نوآبادیات میں اٹکا ہوا تھا۔ اس اجلاس میں حسرت موہانی نے مکمل آزادی کا تصوّر پیش کیا۔

اس رویئے کا نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ عمر قید و بند میں بسر ہوئی۔ سو حسرت موہانی گھر میں کم رہے جیل خانے میں زیادہ۔ مگر اس بندۂ خدا نے جینے کا عجب طور نکالا تھا۔ کہ کسی طور کوئی فرق ہی نہیں پڑتا تھا۔ گھر میں رہے تو کیا اور جیل میں رہے تو کیا۔ جب زندگی کا سارا ساز و سامان مختصر ہوتے ہوتے

ایک لوٹے اور جا نماز تک رہ جائے تو پھر جیل خانہ آدمی کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔

لباس کے نام موٹے جھوٹے کپڑے جن میں ایک وہ ٹوپی تھی جس پر میل اس طرح چڑھا تھا کہ اس کا اپنا کوئی رنگ ہی نہیں رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک چھتری مگر یہ چھتری بھی عجب تھی۔ چھتری نے جب اپنی کمانیوں اور کپڑے سے گلو خلاصی حاصل کر لی تو حسرت موہانی کی چھڑی بن گئی۔ تو ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے ہاتھ میں ایک ٹاٹ کا تھیلا جس میں ایک جوڑی کپڑے اور ایک جا نماز رہا کرتی تھی۔ ساتھ میں ایک ٹوٹا پھوٹا لوٹا۔

اس سامان کے ساتھ گھر سے جیل خانے تک کی مسافت خود بخود مختصر ہو جاتی ہے۔ مگر حسرت موہانی تو اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں میں بھی اسی ساز و سامان کے ساتھ گئے۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ یو۔ پی اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہونے کے لئے جب حسرت موہانی لکھنؤ جایا کرتے تھے تو یہی ان کا سامان ہوتا تھا اور وہ سواریوں والے اکّے میں سواریوں کے درمیان کوچوان کے برابر ٹھنس ٹھنسا کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ لوک سبھا کے اجلاس میں شریک ہونے دلی جاتے تو دستور یہ تھا کہ پیدل قدم مارتے نئی دلی چلے جا رہے ہیں۔ لوک سبھا کے قریب پارلیمنٹ اسٹریٹ پر ایک چھوٹی سی مسجد تھی، یہاں بسیرا کرتے۔ نیچے اخبار بچھا لیتے اور سمجھتے کہ مخمل کے گدّے پر سو رہے ہیں۔

لوک سبھا کے ممبر کی حیثیت سے جو انھیں الاؤنس ملتا اسے غریبوں محتاجوں میں تقسیم کرتے پھر دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوتے ۔ اور اس بڑے شہر سے خالی ہاتھ واپس ہوتے۔

تقسیم کے بعد بھارت میں گرجنے برسنے والا مسلمان تو بس ایک ہی رہ گیا تھا، مولانا حسرت موہانی اس پُرآشوب زمانے میں جب تک زندہ رہے اغیار پر گرجتے برستے رہے ۔ اُردو کے سوال پر ایک دفعہ پارہ بہت چڑھ گیا۔ بھری لوک سبھا میں اُنھوں نے غضب ناک ہو کر اعلان کیا کہ میں اُردو کے سوال کو اقوام متحدہ میں لے جاؤں گا۔

مگر مولانا حسرت موہانی شاعر بھی تو تھے ۔ اور ہاں عاشق بھی ۔ پاکبازی اپنی جگہ اور عشقبازی اپنی جگہ ۔ سو اس مرد بزرگ نے عرشہ جہاز پر عشق کیا۔ اور ڈنکے کی چوٹ کیا ۔ اور اس قلندر نے ساری عمر اپنے عہد کے فسق و فجور کے خلاف جہاد کیا ۔ مگر پھر فاسقانہ شاعری کی۔ ایک عشقیہ شاعری تو خیر ہوتی ہی ہے ۔ مگر مولانا حسرت موہانی نے اپنی شاعری کو فاسقانہ شاعری کا نام دیا۔ اور عشقیہ شاعری کا کیا ہے وہ تو جگر مراد آبادی تک نے کی ہے ۔ مگر فاسقانہ شاعری جس روّیے کی پیداوار تھی اسے تو حسرت موہانی اپنے ساتھ لے گئے اب تو یار لوگ زندگی فاسقانہ کرتے ہیں اور شاعری میں شہید بنتے ہیں جس نے زندگی میں شہادت پیش کی اس نے اپنی شہادت کو کبھی بانس پر نہیں چڑھایا ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ   افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

جلیبیوں سے تجریدی مصوّری تک

یہ بی این آر کا ادبی مذاکرہ تھا۔ موضوع تھا 'فن اور قومی موضوعات' — الطاف گوہر صاحب صدارت کر رہے تھے۔ مسعود الرؤف صاحب سٹیج سیکرٹری تھے۔ اور مشہور ادیب اور فن کار اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ سو ہم نے صوفی تبسّم، احمد ندیم قاسمی، شاکر علی اور اسرار احمد کے مقالے سُنے۔ پروفیسر ڈاکٹر اجمل نے اپنی وضع کو نبھایا اور ناسازیٔ طبع کے باعث تشریف نہیں لا سکے۔

مسعود الرؤف صاحب نے حرفِ آغاز کے طور پر یہ کہا کہ اس مذاکرے کا یہ ہرگز مقصد نہیں کہ ہم ادیبوں کے لئے سمتیں متعین کریں۔ ادیبوں کو دوسروں کے مقرر کئے ہوئے رستوں پر چلانا نہ تو ممکن ہے اور نہ مفید ہے۔ مگر ادب اندھیرے اور ہوا میں گھوڑے دوڑانے کا نام بھی نہیں ہے۔ سو مقصد یہ ہے کہ ادیب عہد کے تقاضوں کے تحت خود نئی راہیں تلاش کرے۔

مسعود الرؤف صاحب نے اپنے وعدے کو نبھایا اور ادیبوں کے لئے

اپنی طرف سے کوئی سمت مقرر نہیں کی۔ الطاف گوہر صاحب نے بھی ایسا نہیں کیا۔ اصل میں اس وقت ادیب کے لئے سمت متعین کرنے کی کڑی ذمہ داری احمد ندیم قاسمی نے اٹھا رکھی تھی۔ ویسے تو جو تحریر انھوں نے پڑھ کر سنائی اسے ہم تہذیب و فن، کے عنوان کے تحت ان کے کالم میں بھی پڑھ چکے تھے۔ مگر اس واقعہ کو کئی ماہ گذر چکے تھے۔ اب اسے سُن لیا تو جو سبق ہم بھول چکے تھے وہ پھر سے یاد ہو گیا۔ ع

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

مگر قاسمی صاحب نے اس مذاکرے کی مناسبت سے کچھ باتیں شاید اضافہ بھی کی تھیں۔ قاسمی صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارا ادب زیادہ تر شہری زندگی کا ادب ہے۔ یعنی ادیب پاکستان کے محض پندرہ فیصدی لوگوں کا ترجمان ہے۔ باقی خلقت سے بے خبر ہے اور پھر یہ کہ وہ مٹی کی خوشبو کی بجائے نظریات کی بھول بھلیاں میں پھنسا ہوا ہے۔

نظریوں کے واسطے سے پیدا ہونے والے اَدب پر قاسمی صاحب کو برستے دیکھ کر ہمارے برابر ایک دانشور چونکا۔ اور بولا کہ قاسمی صاحب نے آج تو سارے ترقی پسند ادب پر سہاگہ پھیر دیا۔

اس مقالے کے دوران قاسمی صاحب کو لمحہ بھر کے لئے یہ خیال ضرور آیا تھا کہ موجودہ معیشتی ڈھانچے میں رہتے ہوئے ادیب کے لئے شہر سے نکل کر دیہاتی زندگی سے رشتہ پیدا کرنے اور پاکستان کی پوری زمین سے آشنائی

حاصل کرنے کی گنجائش نہیں ہے ۔ مگر انھوں نے اس خیال کو اپنے استدلال میں کھنڈت پیدا کرنے کی اجازت نہیں دی ۔ سو انھوں نے جلد ہی اس بات کو چھوڑ کر یہ سوال اٹھایا کہ آخر مغربی پاکستان کے ادیب مشرقی پاکستان کے لوگوں میں سے اپنے کردار کیوں نہیں چنتے اور مشرقی پاکستان کے ادیب مغربی پاکستان کی زندگی کو اپنے ادب کا موضوع کیوں نہیں بناتے ۔

مگر صوفی تبسم نے اس سے بہت مختلف باتیں کہیں ۔ اول تو انھیں مذاکرے کے عنوان ہی پر اعتراض تھا ۔ وہ کہتے تھے کہ عنوان فن اور قومی موضوعات کی بجائے فن اور قومی مسائل ہوتا تو زیادہ مناسب تھا ۔ اس لئے کہ شعر اور افسانہ موضوعات پر نہیں لکھے جاتے البتہ مسائل کی ترجمانی ضرور کرتے ہیں ۔

صوفی صاحب نے یہ بات یہاں چھوڑ دی ۔ اسے بڑھایا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہو گا کہ کیا یہ مسئلہ ادب میں محض موضوع کے طور پر آیا ہے یا اس نے ایک جیتی جاگتی انسانی صورت حال یا ایک تجربہ بن کر اظہار پایا ہے ۔ ویسے صوفی صاحب نے جو باتیں کہیں ان سے بالواسطہ طور پر اس سوال پر روشنی پڑتی ہے ۔ صوفی صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ ہماری قدیم شاعری خارجی ماحول سے اتنی بے تعلق نہ تھی جتنا یار لوگ سمجھتے رہے ہیں ۔ انھوں نے خارجی حالات سے براہ راست تعلق کی مثال میں سعدی کے مرثیہ زوال بغداد کا ذکر کیا ۔ مگر اسی سانس میں انھوں نے حافظ شیرازی کا ذکر کیا جس کی غزل کا خارجی حالات

سے براہ راست رشتہ نظر نہیں آتا. مگر صوفی صاحب نے کہا کہ جب حافظ ایسے شعر کہتا ہے ؎

بیا کہ قصرِ امل سخت سست بنیاد ست
بیار بادہ کہ بنیادِ عمر بر باد ست

تو اس کے پیچھے اس عہد کی تباہی اور بربادی کا تجربہ منڈلا رہا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ ہمیں اس وقت اس بزرگ کا دم بہت غنیمت نظر آیا ورنہ قاسمی صاحب تو اپنی طرف سے ادب کی سمت متعین کر گئے تھے کہ ادب کو بس موضوعاتی ہونا چاہیئے۔

اس نقطۂ نظر کی تردید کچھ صوفی صاحب نے کی، کچھ شاکر صاحب نے کی. شاکر صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ ایک معاشرہ یا ایک عہد جن خارجی اور داخلی تجربات سے گزر رہا ہے وہ مل جل کر ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں. سو یوں محاکمہ نہیں کرنا چاہیئے کہ فلاں آرٹ میں فلاں موضوعات نہیں پائے جاتے۔ پاکستانی مصوری پر یہ الزام کہ اس کے موضوعات پاکستانی نہیں ہیں اسی نوعیت کا ہے. مگر مصوری تو اپنے اسلوب کے باعث اس طرح کا کھلا ڈلا اظہار ہے ہی نہیں جس طرح شاعری ہوتی ہے. اور یہ سنتے ہوئے ہم نے سوچا کہ شاکر صاحب کی جگہ کوئی شاعر ہوتا تو یوں کہتا کہ شاعری اپنے اسلوب کی بنا پر اس طرح کا کھلا ڈلا اظہار ہے ہی نہیں جس طرح صحافت ہوتی ہے۔

ان مقالوں کو سنتے ہوئے ہم نے مسئلہ کو یوں سمجھا کہ آرٹ اور ادب میں خارجی حالات سے، معاشرے سے، قومی زندگی سے رشتہ کبھی کبھی کھلا ڈلا بھی ہوتا ہے۔ اس صورت میں وہ رشتہ فوراً پہچانا جاتا ہے۔ مثلاً بی این آر میں زراعت بڑھاؤ کے موضوع پر نظموں کا مقابلہ ہو اور اس میں قاسمی صاحب کپ جیت کر لے جائیں، تو یہاں شاعری اور قومی زندگی میں رشتہ اتنا واضح ہوگا کہ فوراً سمجھ میں آجائے گا۔

مگر ادب اور آرٹ میں قومی زندگی سے یا معاشرے سے یا خارجی حالات سے رشتہ بالعموم اتنا پُراسرار ہوتا ہے کہ دقتِ نظر کے بغیر سمجھ میں نہیں آتا۔ اِس صورت کو ہم نے الطاف گوہر صاحب کے ایک بیان کے واسطے سے سمجھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اگر کہیں بھاٹی دروازے میں ایک حلوائی ایک خاص انداز سے میدے اور شکر کو آمیز کر رہا ہے اور اسے رنگ دے رہا ہے اور پھر خاص طریقہ سے ہاتھ کو گھما کر جلیبی بنا رہا ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسی شہر کے ایک گوشے میں ایک مصوّر شاکر علی بیٹھا تصویریں بنا رہا ہے۔

اِس مثال سے ہم نے یہ سمجھا کہ قومی زندگی سے اثر قبول کرنے اور قومی زندگی پر اثر ڈالنے کا دوگونہ عمل ادب اور آرٹ میں پُرپیچ اور پُراسرار ہوتا ہے۔ یہ عمل اندر ہی اندر کسی تہہ میں جاری رہتا ہے اور کبھی کبھی ہم شعر و ادب سے بالکل بے تعلق روزمرہ کی کسی سرگرمی میں آرٹ یا ادب کے کسی اسلوب کا اثر دریافت کرتے ہیں

اور حیران رہ جاتے ہیں۔

ادب اور زندگی کے اس تہہ در تہہ رشتے کے احساس کے تحت ہی شاید الطاف گوہر صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ ادب جب زندگی سے فرار ہوتا ہے تب بھی وہ زندگی سے ہم رشتہ ہی ہوتا ہے۔

ویسے چلتے چلتے ایک صاحب ہم سے پوچھنے لگے، قاسمی صاحب ان لکھنے والوں پر بہت برس رہے تھے جو جانوروں کو علامتیں بنا کر کہانیاں لکھتے ہیں۔ اور انسانی زندگی کے حسن پر نظر ہی نہیں ڈالتے۔ آخر یہ کون لوگ ہیں؟

ہم نے کہا کہ اصل میں قاسمی صاحب کو آج لقمان حکیم پر غصہ آ رہا تھا۔

پی۔ آئی۔ اے کلچر سے ہپی کلچر کی طرف

دوش پہ گیسو بکھرے ہوئے، بر میں بھڑکیلے رنگ کا کرتہ۔ جیسے گنواریاں پہنتی ہیں۔ ٹانگوں میں مردانہ شرعی پائجامہ۔ یعنی موٹے جھوٹے لٹھے کا ترشا ہوا، ٹخنوں سے اوپر اٹھا ہوا، پائنچا کھلا ہوا۔ یہ لاہور کی ایک ہپی تھی۔ صاحبو بات یہ ہے کہ اگر کوئی لڑکی علی گڑھ کٹ مردانہ پائجامے میں ملبوس نظر آئے تو سمجھو کہ یہ پی۔ آئی۔ اے کلچر ہے۔ لیکن اگر کوئی لڑکی دوش پہ گیسو بکھیرے اور شرعی مردانہ پائجامہ پہنے دکھائی دے تو جانو کہ یہ ہپی ہے۔ اور لاہور کو پہلے پی۔ آئی۔ اے کلچر لے اڑا۔ اب ہپی کلچر سر اٹھا رہا ہے۔ ایئر ہوسٹسوں کا لباس کیا بدلا گیا کہ وہ پائجامہ جو علی گڑھ کے طلبا، کسی زمانے میں پہنا کرتے تھے لاہور کی لڑکیوں میں پھیل گیا۔

اَب چند دِنوں سے اس پائجامے نے ایک اور رنگ بدلا ہے۔

ہپی لڑکی نے اس کا پائنچا چوڑا تراشا، ٹخنوں سے اونچا رکھا۔ اور اس طرح اس پائجامے کی حدیں شرعی پائجامے سے جا ملیں۔ ادبی حلقوں کے لوگ یوں سمجھیں

کہ آجکل محمد حسن عسکری جیسا پائجامہ پہنتے ہیں عین بین ویسا ہی پائجامہ اور کبھی کبھی اسی کپڑے کا لاہور کی ہپی لڑکیاں پہنتی ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ ہپی کون ہیں؟ ہپیوں نے ابھی اپنے ایک اشتہار میں یہ اعلان کیا ہے کہ "خبردار ہوشیار۔ ہم ہپی لوگ ترقی پسند ہیں"۔ اس اعلان کے ساتھ ہمارا دھیان دور دور گیا۔ کبھی فیض صاحب کی طرف کبھی قاسمی صاحب کی طرف کبھی صفدر میر کی طرف۔ تو گویا یہ سب ہپی ہیں۔ مگر کیا کہا جا سکتا ہے۔ ہپی لڑکی تو اپنے پریشان گیسوؤں اور مردانہ پائجامے سے پہچانی جاتی ہے۔ ہپی نوجوان کو ہم کیسے پہچانیں۔ ایک زمانے میں ترقی پسند ادیب بے شک اپنے کھدر کے کرتے موٹے شیشے کی عینک اور بڑھی ہوئی حجامت سے پہچانے جاتے تھے۔ مگر کچھ عمر کا تقاضا اور کچھ زمانے کا رنگ کہ صفدر میر کے چہرے پر بس موٹے شیشے کی عینک رہ گئی اور فیض صاحب سوٹ بوٹ سے لیس ہو کر انٹر کانٹی نینٹل میں کلچر کی تقریبوں میں صدارت کرتے ہیں اور کلچر کے امور کا انتظام و انصرام کرتے ہیں۔

بہر حال اعلان پڑھ کر ہم پھڑک گئے۔ سوچا کہ چیڑی اور دو دو ہپی بھی اور ترقی پسند بھی۔ لیک چھیک پارک لگژری ہوٹل پہنچے۔ جہاں ایک ہپی لڑکی نے اپنی تصویریں سجا رکھی تھیں۔ یہ صاحبزادی شاہین شمشیر علی تھیں۔ ان کی تصویریں واہ واہ سبحان اللہ۔ کبھی ہم تصویر دیکھتے تھے کبھی تصویر کے عنوان پہ غور کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی یوں لگا کہ مضمون سارا عنوان میں ہے اور تصویر محض عنوان ہے۔ چند

عنوانات ملاحظہ فرمایئے :

- مجھے یوں لگتا ہے کہ میں کوئی کھٹمل ہوں۔
- اقبال مندی، شانتی، پریم اور ضبطِ تولید سے عبارت ہے۔
- خارجی کائنات تمہارے اندر ہے۔
- کیا پھول اس لئے کھلتے ہیں کہ قبروں پر چڑھائے جائیں۔
- تباہ و برباد کرنے کے معنی ہیں تخلیق کرنا۔
- ایک مرتبہ تم کوئی بھی فعل کر سکتے ہو۔
- بوٹی سے کائنات کے خاکے میں نرمی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔
- زندگی دھوکا ہے۔
- موت حقیقت ہے۔
- خودکشی کرنے میں ہچکچاہٹ مت دکھاؤ۔

یہاں کچھ شخصیتوں کے خاکے بھی دکھائی دیئے۔ زیادہ ممتاز شخصیتیں یہ یہ تھیں۔ نپولین، ایلوس پریسلے، آئن سٹائن، راسپوٹین، گاندھی جی۔

گاندھی جی کی تصویر دیکھ کر کچھ لوگ ٹھٹھکے۔ کسی نے ڈھیٹ بن کر پوچھ ہی لیا کہ شخصیتوں کی اس صف میں گاندھی جی تو نظر آ رہے ہیں مگر قائدِ اعظم دکھائی نہیں دیتے۔ جواب ملا کہ قائدِ اعظم ہپی نہیں تھے۔

ہپیز کے لئے FLOWER CHILDREN کا لقب بھی استعمال

کیا گیا ہے۔ اردو میں آپ انھیں گُل زادے کہہ لیجئے۔ پھول شہزادی کی کہانی تو ہم نے سُنی تھی۔ کچھ اس رنگ کی کہ رات جب آتی تھی تو فلاں فلاں پھول سے شہزادی برآمد ہوتی تھی۔ یہاں ہم نے یہ دیکھا کہ گملا ہے اور گملے میں نوجوان اُگ رہے ہیں۔ ہپیوں یا گل زادیوں کی تعریف صاحبزادی شاہین شمشیر علی نے یہ کی کہ ان کے مسلک میں وہ ساری اقدارِ حیات شامل ہیں جو انسان کا مرتبہ بلند کرتی ہیں۔ مثلاً آزادی، مساوات، محبت، شانتی اور عرفانِ ذات۔ جن شخصیتوں کی تصویریں بنائی گئی ہیں ان کے متعلق صاحبزادی صاحبہ فرماتی ہیں کہ یہ لوگ عصرِ رفتہ اور عصرِ حاضر کے وہ دانشور انقلابی ہیں جو اپنے لفظوں، کارناموں، نغموں اور گیتوں کی بنا پر اس مسلک کے گرد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تو گویا ایلوس پریسلے اور آئن سٹائن دونوں ہی دانشور انقلابی ہیں۔

ایک تصویر نے یاروں کو بہت تشویش میں ڈالا۔ اس کا عنوان تھا: "خودکشی کرنے میں ہچکچاہٹ مت دکھاؤ"۔ ہم نے برہم گیسوؤں والی ہپیوں کو دیکھا اور کچھ حیرت اور کچھ افسوس کے ساتھ سوچا کہ یہ ان کے دماغ میں کیا سمائی ہے۔ کیا کرنے کی ٹھانی ہے۔ ایک نوجوان سخت تشویش کے عالم میں آگے بڑھا اور ہپی مصوّرہ سے سوال کیا کہ کیوں جناب آپ نے خودکشی کے حق میں جو نعرہ بلند کیا ہے کیا واقعی اس پہ ایمان ہے۔

مصوّرہ نے تامل کیا۔ پھر بولی کہ میں نے تو یورپ کے ایک رجحان کی تصویر

کشی کی ہے۔

یہ جواب سُن کر نوجوان نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور واپس آکر خبر دی کہ تشویش بلا سبب ہے۔ قوم کو خیر و عافیت جن کی مطلوب ہے ان کی خیر و عافیت ہے۔ خودکشی کا خیال ان سے کوسوں دور ہے۔

بہرحال لاہور میں ہپی آرٹ کی یہ پہلی نمائش تھی۔ کہنے والے اسے ہپی آرٹ کہیں گے۔ مگر صاحبزادی شاہین نے اسے PSYCHEDLIC مصوری بتایا ہے اور سنجیدگی سے اس کی وضاحت کی ہے۔ مگر جسٹس کارنیلیس صاحب نے نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے اسے فراری آرٹ ٹھہرایا۔ اور یورپ کے نوجوانوں کے متعلق فتویٰ عام دیا کہ وہ زندگی سے فرار کر رہے ہیں۔

کلچر کے مضمون کا پرچہ مشکل آیا ہے

ابھی پچھلے دنوں وزارتِ تعلیم کی طرف سے کلچرل امور کی جانچ پڑتال کے لئے ایک کمیٹی قائم ہوئی تھی۔ صدر فیض صاحب بنے۔ کچھ جانے پہچانے ادیب کمیٹی میں شامل ہوئے۔ یاروں نے چار دن اس کمیٹی کے بارے میں چہ میگوئیاں کیں اور فیض صاحب کے نئے مرتبے پر اظہارِ مسرت کیا اور چپ ہو گئے۔ بالعموم تو یہی ہوتا ہے کہ کمیٹی کے قیام کے ساتھ چند دن تک اس کا چرچا رہتا ہے۔ پھر بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔ مگر اس کمیٹی کے سلسلہ میں ایسا نہیں ہوا۔ کمیٹی کے قیام کی خبر ابھی حافظہ سے محو نہیں ہوئی تھی کہ فیض صاحب کی طرف سے یاروں کو دعوت نامے موصول ہوئے کہ ہم آرہے ہیں۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

آؤ اور ہم سے کلچر کے امور پر تبادلہ خیال کرو۔

اس دعوت نامے کو پڑھ کر ہم بہت چکرائے کہ یا اللہ کونسی منزل درپیش۔

ہے۔ جانے کیا مسئلہ درمیان میں آجائے۔ جانے وہ کیا پوچھیں اور ہمارے منہ سے کیا نکلے۔ اور پھر ہم یہ کہتے ہوئے گھر واپس آئیں کہ ع

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

فیض صاحب کی چھٹی میں مطلب در بطنِ شاعر رہا مگر بانو قدسیہ نے لیے میں یہ ہو کر بلّی تھیلے سے باہر نکال دی۔ یعنی ابھی ہم فیض صاحب کے دعوت نامے سے جاں بر نہ ہونے تھے کہ بانو قدسیہ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک پلندہ ہم پر آپڑا۔ اس پلندے میں دس سوال بند ہیں۔

صاحبو منصفی کرد۔ ایک طرف فیض صاحب کا بلاوا ہے اور انٹرویو کے اندیشہ ہائے دور دراز ہیں۔ فیض صاحب کمیٹی کے چیئر مین ہیں۔ بانو قدسیہ کمیٹی کے اراکین میں سے ایک رکن ہیں۔ دونوں شخصیتیں قابلِ احترام ہیں۔ ہم درمیان میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اور کچھ اس قسم کے امتحان سے دوچار ہیں کہ ے

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں

ادھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

سوال یہ ہے کہ اگر منہ زبانی باتوں سے کام چل سکتا ہے تو تحریری جوابات کیا ضرور ہیں۔ اور اگر تحریر درکار ہے اس مقصد سے کہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے تو منہ زبانی باتوں میں کیوں وقت ضائع کیا جائے۔ اور ہمارا تو وقت ہی ضائع ہوگا۔ مگر ادھر وقت بھی ضائع ہوگا اور پیسہ بھی خرچ ہوگا۔ کمیٹی میں شامل ادیب

معمولی حیثیت والے تو نہیں ہیں بڑے ادیب ہیں۔ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل سے کم درجہ کے ہوٹل میں کیا قیام کریں گے۔

ایک لمحہ کے لئے ہمیں یونہی شک سا گذرا کہ کمیٹی نئی نئی قائم ہوئی ہے۔ ابھی آپس میں ربط نہیں ہے۔ چیئرمین صاحب نے کراچی میں بیٹھ کر اپنی کارروائی کی۔ بانو قدسیہ نے لاہور میں بیٹھے بیٹھے کلچر کے میدان میں اپنا کاغذی گھوڑا دوڑا دیا۔ لیکن اگر بالفرض یہ بات ہے تو بانو قدسیہ کمیٹی کی اکیلی ممبر تو نہیں ہیں اس کمیٹی میں تو بشمول فیض صاحب پورے چھ ممبر ہیں۔ اگر ہر رکن نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کاغذی گھوڑے دوڑائے اور ہر کاغذی گھوڑا دس سوالوں کی سواری سے لدا پھندا آیا تو ہم تو میدانِ پانی پت کی طرح پامال ہو کر رہ جائیں گے۔

میدانِ پانی پت کے حوالے سے ہمیں مولانا حالی یاد آگئے۔ ویسے مولانا حالی تو ہمیں بانو قدسیہ کا سوالنامہ پڑھ کر بھی یاد آگئے تھے۔ ذرا اس سوال پر غور فرمایئے:

" کیا آپ کے خیال میں ڈرامے کو قومی مفاد کے لئے استعمال کیا جانا چاہئے۔۔ یا تفریح کے لئے۔ ؟ "

اس سوال سے ہمیں فائدہ یہ پہنچا کہ مقدمہ شعر و شاعری کا مضمون جو ذہن سے اتر چلا تھا پھر سے تازہ ہو گیا۔ یوں لگا کہ ہم امتحان کے کمرے میں بیٹھے ہیں اور ادیب عالم کا پرچہ حل کر رہے ہیں۔

اصل میں مولانا حالی کے زمانے میں یہ سوال بڑا زندہ سوال تھا. مگر اس زمانے کے گذر جانے کے بعد طرح طرح کے سوال کھڑے ہو گئے. کہ قومی مفاد کسے کہتے ہیں اور تفریح کس شے کا نام ہے اور کیا ان دونوں میں کوئی تضاد ہے اور آخر اس سوال کو یہ کہہ کر لپیٹ دیا گیا کہ یہ اصطلاحیں ہی ناکافی اور ناقص ہیں. ان کے ذریعے کسی تخلیقی سرگرمی کی توجیہہ و تفسیر نہیں ہو سکتی. اب اس سوال پر غور کرنے کی سعادت صرف وہ طلبہ حاصل کرتے ہیں جو اورنٹیل کالج میں داخلہ لیتے ہیں اور وہاں کے اساتذہ سے مقدمۂ شعر و شاعری کے مطالب سمجھ کر امتحان پاس کرتے ہیں.

فیض صاحب کا ادبی مرتبہ مسلّم، مگر وہ اپنی کمیٹی والوں کو بھی تو سمجھائیں کہ ادیب امتحان دینے میں ذرا کچے ہوتے ہیں. ان سے ایسے سوال مت کرو جن کے جواب دینے کے لئے انہیں اورنٹیل کالج میں داخلہ لینا پڑ جائے.

خیر ادیب نے اردو کا ایم. اے نہ بھی کیا ہو تو بھی اسے کچھ نہ کچھ آب حیات اور مقدمۂ شعر و شاعری کا اتا پتہ ہوتا ہے. مگر ہمیں ایک مصور ملا جو اس سوالنامے کو سن کر بہت پریشان تھا اور کہہ رہا تھا "یار پرچہ بہت سخت آیا ہے."

خیر یہ تو امیچور آرٹسٹ تھا ایک پروفیشنل آرٹسٹ نے کہا کہ "اس کے حل کرنے کی فیس کیا ہو گی. وہ تو بھیجنے والے نے بتائی ہی نہیں."

گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟

لیجیے صاحب کلچر اور آرٹ پر جو کمیشن بٹھایا گیا تھا وہ لاہور میں آکر بیٹھ گیا ہے۔ آج اور کل میں جس آرٹسٹ سے ملاقات ہوئی وہ آرٹ کونسل کی طرف رواں دواں نظر آیا۔ ہم نے پوچھا اماں خیر تو ہے۔ جواب ملا کہ خیر کیسی۔ آرٹ پر انٹرویو دینے جاتے ہیں۔ دعا کرو کہ کامیاب واپس آئیں۔ اسی رو میں کہیں شاکر علی سے بھی مڈبھیڑ ہوگئی۔ بے چارے بہت پریشان تھے۔ کہہ رہے تھے کہ یار و کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ہم سے کیا پوچھا جائے گا۔ ہم نے کہا کہ آپ کو تو پتہ ہونا چاہیے کہ آپ کو کیا کہنا ہے۔ اس پر انھوں نے سر کھجایا اور کہا کہ ہمیں کیا کہنا ہے۔ یہی ہوگا کہ جسے کسی کلچرل ادارے سے شکائتیں ہیں وہ اس ادارے کے خلاف بولے گا۔ جس کی سمجھ میں تصویر نہیں آتی وہ تجریدی مصوری کے خلاف زہر اگلے گا۔

تب ہم نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا کہ صاحب وہ زمانہ گیا جب آپ اپنے آپ میں مگن تصویر بناتے تھے۔ اور تجریدیت کو مہمل بتانے والوں کی باتیں ایک

کان سنتے تھے دوسرے کان اُڑا دیتے تھے۔ اب تو یہ ہوگا کہ بانو قدسیہ موضوع بنائیں گی اور آپ تصویر بنائیں گے۔ پھر جب تصویر بن کر کمیٹی کے سامنے جائے گی تو بانو قدسیہ اس پر نوٹ لکھیں گی کہ تصویر عوام کی سمجھ سے بالا ہے۔ موضوع کی قومی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے اس طرح سے بیان کیا جائے کہ سب کی سمجھ میں آجائے۔

یارو اِس بات کو مذاق مت سمجھنا۔ بانو قدسیہ صاحبہ کے تیور تو یہی ہیں۔

انھوں نے جو سوالنامہ جاری کیا ہے اس میں سے چند سوالات ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ ڈرامہ، موسیقی، ناچ، فوٹوگرافی اور مصوری میں آپ کے نزدیک کس قسم کے موضوعات پر زور دینا چاہیئے؟

۲۔ کیا آپ ایکٹروں، ڈرامہ نویسوں، موسیقاروں، مصوروں اور دوسرے ثقافتی منصوبوں میں کام کرنے والوں کے لئے کوئی منظم ادارہ بنانے کی سکیم رکھتے ہیں جس میں ان کے حقوق کا تحفظ ہوسکے۔ اور قومی سطح پر ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔

۳۔ کیا آپ کے خیال میں ڈرامے کو قومی مفاد کے لئے استعمال کیا جانا چاہیئے یا تفریح کے لئے؟

۴۔ آرٹ کو عام آدمی تک پہنچانے کے لئے کیا آپ کے پاس کوئی پلان، مشورہ یا سکیم ہے۔

فنونِ لطیفہ کی اس مجوزہ منصوبہ بندی کا سہرا ہم تو فیض صاحب کو بصد ادب نظر انداز کر کے بانو قدسیہ کے سر باندھ چلے تھے۔ مگر بیچ میں اپنے

دوست صفدر میر عرف زینو ٹپک پڑے۔ ویسے تو ہمارا ماتھا اسی روز ٹھنکا تھا جس روز یہ کمیٹی وجود میں آئی تھی۔ ہم نے سمجھ لیا تھا کہ ایک مرتبہ پھر ہمیں صفدر صاحب سے آرٹ پر پند و نصائح سے بھرپور ایک وعظ سننا پڑے گا۔ خیر وعظ ہونا تھا سو ہوا۔ مگر اس طویل انگریزی وعظ میں انھوں نے اشاروں اشاروں میں یہ بھی بتا دیا کہ میں بہت دنوں سے پاکستانی ادیبوں اور فنکاروں کی داخلیت پسندی، قنوطیت، بے مقصدیت اور فراریت پر نالہ و زاری کر رہا تھا۔ الحمدللہ کہ نالوں کا جواب افلاک سے آیا۔ اور کلچر اور آرٹ پر تحقیقاتی کمیٹی قائم ہو گئی۔ صاحبو مطلب اس کا یہ ہوا کہ پاکستان میں تخلیقی سرگرمی کے ساتھ اب جو نیکی ہونے والی ہے اس کا ثواب صرف کمیٹی والوں کو نہیں پہنچے گا۔ اس ثواب کے سب سے بڑے مستحق تو اپنے صفدر صاحب ہیں۔

بانو قدسیہ نے تو چند بندھے ٹکے سوال کر کے اپنے قومی شعور کا مظاہرہ کیا۔ مگر صفدر میر صاحب نے قومی ادب اور قومی آرٹ کی ضرورت پر ایک بسیط خطبہ قلم بند کیا اور ایک ادیب نے ہم سے کیا خوب کہا کہ یار جو لوگ ادب اور آرٹ میں قومی شعور کے فقدان کا ماتم کرتے ہیں انھیں کی تحریروں سے قومی شعور سے بے تعلق ادب کی کامیاب مثالیں مرتب ہوتی ہیں۔

چلیئے صاحب مانے لیتے ہیں کہ پاکستان کے ادیبوں اور آرٹسٹوں میں قومی شعور کا فقدان ہے۔ اور اب وقت آ گیا ہے کہ قومی موضوعات کی گھنٹی ان کے گلے میں باندھ دی جائے۔ مگر یارو بتاؤ کہ گلے میں یہ گھنٹی باندھے گا کون؟

مگر معاف کیجئے یہ سوال ہمارا نہیں، ایک ڈرامہ نگار دوست نے ہم سے یہ سوال کیا تھا۔ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ خیر میں تو بے شعور ہُوا مگر میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کونسا صاحبِ شعور بزرگ ہے جو مجھے یہ بتا سکے گا کہ فلاں موضوع قومی اہمیت کا حامل ہے اس پر ڈرامہ لکھو۔ ہم نے کہا فیض صاحب کمیٹی کے چیئرمین ہیں ان پر اعتبار کرو۔

ڈرامہ نگار نے تامل کیا۔ پھر بولا کہ یار برا مت ماننا۔ فیض صاحب بہت بڑے ادیب ہیں۔ مگر میں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں اور مجھے پتہ ہے کہ وہ پاکستانی تہذیب کی تعریف کس طرح کرتے ہیں اور کون سے قومی شعور کی وکالت کرتے ہیں۔ میں جنگِ ستمبر پر ڈرامہ لکھنے کو پھر رہا ہوں وہ کہیں گے کہ جنگ پر نہیں امن پر لکھو۔ تو معاف کرنا اس قومی شعور کو قبول کرنے میں مجھے کچھ تامل ہے۔

ہم نے کہا کہ اچھا تم صفدر میر کے قومی شعور پر اعتبار کرو۔ اور جس موضوع کو وہ قومی اہمیت کا حامل قرار دیں اس پر ڈرامہ لکھو۔

صفدر میر کا نام سُن کر ڈرامہ نگار اچھل پڑا اور بولا کہ یار صفدر میر تو راجہ پورس کو قومی مزاحمت کی علامت قرار دیتا ہے۔ اس علامت کو میں نے تسلیم کر لیا تو سندھ کے ترقی پسند میرے گلے پڑ جائیں گے۔ کہ اب راجہ داہر کو بھی قومی مزاحمت کی علامت تسلیم کرو۔ پھر میں محمد بن قاسم سے کیا رول منسوب کروں گا۔ اور برِعظیم میں آنے والے مسلمانوں کی آمد کی کیا توجیہہ کروں گا۔ تو مجھے ایسے قومی شعور سے معاف ہی رکھو۔

ہم نے کہا کہ اچھا پھر تم بانو قدسیہ کے قومی شعور سے سند لو۔ وہ تمہیں ڈرامے کے لئے قومی موضوعات بتائیں گی۔ بانو قدسیہ کا نام سن کر ڈرامہ نگار ہنسا اور بولا، کہ اچھا اب بانو قدسیہ بھی قومی مسائل کے بارے میں سوچتی ہیں۔

ہنسی کچھ اتنی معنی خیز تھی کہ ہم سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ہمیں یونہی خیال آیا کہ بانو قدسیہ کے ڈرامے تو ہم نے بھی دیکھے اور سُنے ہیں۔ تفریحی مسالہ ان میں بہت ہوتا ہے مگر اپنے قومی شعور کو تو انہوں نے بالعموم اپنے سامعین اور حاضرین سے چھپا کر ہی رکھا۔ بہر حال اچھا ہی ہے کہ کلچرل کمیٹی قائم ہو گئی۔ اس کے بعد کوئی باوقار کلچرل ادارہ ظہور میں آئے گا۔ اس سے یہ تو ہو گا کہ جن دانشوروں کے قومی شعور کا ان کی تحریر سے ہمیں پتہ نہیں چلا ہے اس کا اس بہانے پتہ چل جائے گا۔

آرٹ کو عام آدمی تک پہنچانے کے سوال پر ایک دانشور کو ہم نے یہ کہتے سُنا کہ آرٹ کونسل میں ہونے والے ڈراموں اور تجریدی تصویروں کو عام آدمی تک آپ لوگ کیوں لے جانا چاہتے ہیں۔ پہلے ہمیں بور کیا اب غریب عام آدمی کو CONFUSE کرو گے۔

وَیسے ہم نے تو اس کمیٹی کی نقل و حرکت سے یہ جانا ہے کہ آرٹ خواص کی ملکیت ہے۔ جبھی تو اس کمیٹی نے عام لوگوں کی رائیں حاصل کرنے کے لئے کوئی ایسا سوالنامہ مشتہر نہیں کیا۔

(۱۱ ۶/ ۶۸)

بربنائے کثافت اور بربنائے ثقافت

قدرت اللہ شہاب صاحب تقریر کر رہے تھے اور بچے ان کا منہ تک رہے تھے۔ یہ بچے آرٹسٹ ضرور تھے۔ مگر نہ اتنے کہ آرٹ کے بارے میں شہاب صاحب کے نظریات کو سمجھیں اور گرہ میں باندھ لیں۔ خود شہاب صاحب کو بھی یہ احساس تو تھا مگر انھوں نے بجا کہا کہ مائک ایک دفعہ تصرف میں آجائے تو اسے جلدی چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ویسے بھی لاہور کی آرٹ کونسل میں ان کی یہ پہلی تقریر تھی۔ ہم نے اسی شہر میں انھیں اور مقامات پر تو دیکھا اور سنا تھا مگر یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہم نے آرٹ کونسل کے لینڈ سکیپ میں ان کی دید کی۔ آرٹ کونسل کا لینڈ سکیپ آج کچھ بدلا بدلا تھا۔ شہاب صاحب کہہ رہے تھے کہ جو آرٹ عوام تک نہیں پہنچتا وہ ثقافت کو نہیں فالج کو فروغ دیتا ہے۔

یہ بیان سن کر ہم نے ارد گرد نظر ڈالی۔ ہماری نظر فالج کو فروغ دینے والوں کو تلاش کر رہی تھی۔ بات یہ ہے کہ فالج کو فروغ دینے والے بھی تو دو قسم کے

ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو تجریدی تصویریں بنا کر فالج کو فروغ دیتے ہیں اور ایک وہ جو شعر اور افسانے لکھ کر فالج کو فروغ دیتے ہیں۔ اوّل الذکر میں سے ہم نے وہاں کسی کو موجود نہ پایا۔ ثانی الذکر قبیلہ سے اپنے بہت سے بزرگ وہاں موجود تھے۔ یعنی ابن انشا اور اشفاق احمد بھی تھے۔ ممتاز مفتی بھی تھے۔ احمد ندیم قاسمی بھی تھے۔ اور خود قدرت اللہ شہاب مہمانِ خصوصی تھے۔ اور اس وقت وہ بچوں کے آرٹ کی نمائش کا افتتاح کر رہے تھے۔

شہاب صاحب کہتے تھے کہ کلچر کی دنیا میں بھی ایک سول لائنز کا علاقہ ہے۔ یوں کلچر اتنی پھیلی ہوئی چیز ہے کہ زندگی کی ساری سرگرمیاں اسی میں سماتی نظر آتی ہیں۔ مگر یاروں نے پاکستان کے بیس برسوں میں کلچر کو خوب چھانا پھٹکا اور پاک صاف کر کے آرٹ کونسلوں کی حرم سراؤں میں بٹھا دیا۔ تو آرٹ کونسلیں کلچر کی دنیا کی سول لائنز ہیں۔ خطاطی تو شغولیوں کی بیٹھکوں میں رہ گئی۔ قرأت کا اہتمام کرنا ہو تو کسی انجمن اسلامیہ سے رجوع کیجیے۔ قوالی سے روح کو غذا پہنچانی ہو تو کسی خانقاہ میں جائیے۔ آرٹ کونسل میں کلچر ہے مگر ہماری تہذیبی روایات کے عناصر سے مبرا ہے۔

شہاب صاحب نے ہیر وارث شاہ کے ایک اصلی تے وڈے نسخے کا ذکر کیا جس کے بارے میں اعلان کیا گیا ہے کہ اس کے مختلف حصے ہم نے بر بنائے کثافت حذف کر دیئے ہیں۔ ان کی جگہ اخلاقی سبق ڈال دیئے ہیں۔ ہم نے یہ سنا اور سوچا کہ ہیر وارث شاہ سے بہت سی شاعری بر بنائے کثافت

خارج کی گئی اور آرٹ کونسلوں سے بہت سا تہذیبی ورثہ بربنائے ثقافت خارج کیا گیا۔ مگر اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ اس کی مثال یوں لو کہ عید المبارک پر کسی ترقی پسند شاعر کو ایک مداح نے شاہی مسجد میں دیکھا اور حیرت سے سوال کیا کہ آپ تو مذہب کو رجعت پسندی کہتے تھے؟ شاعر نے کہا درست ہے مگر عید کی نماز تو کلچر ہے۔ یعنی نئے دانشور اس مذہبی روایت کو جس پر شہاب صاحب کو بہت اصرار تھا کبھی بربنائے ثقافت رد کر دیتے ہیں اور کبھی بربنائے ثقافت قبول بھی کر لیتے ہیں۔ مگر بات تو ایک ہی ہوئی۔

ویسے تو مطلب آم کھانے سے ہونا چاہیے نہ کہ پیڑ گننے سے۔ ایک مستحسن روایت جس حوالے سے بھی اپنائی جائے اچھی بات ہے۔ بربنائے ثقافت کا حوالہ بھی ایسا غلط تو نہیں مگر اس سے کبھی کبھی عجیب قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم اسی آرٹ کونسل میں ایک محفل میلاد میں شرکت کا ثواب حاصل کر چکے ہیں۔ مگر وہ عجیب منظر تھا۔ وہ حال جو ڈرامے کی تقریب سے کھچا کھچ بھر جاتا ہے خالی خالی تھا۔ جتنے میلاد پڑھنے والے تھے اتنے ہی میلاد سننے والے تھے۔ اور اس پر بھی غور کرو کہ وہ یکمشت سامعین کرسیوں پر متمکن بیٹھے تھے۔ نہ عقیدت سے سر جھکے ہوئے نہ درود شریف کا ورد۔ میلاد خواں ان باہوش سامعین سے بے نیاز اپنی کیفیت میں سرشار تھے۔ اور اک سپردگی کے عالم میں میلاد پڑھے جا رہے تھے۔ تب ہم نے یہ طے کیا کہ اس محفل میلاد میں حاضرین بربنائے ثقافت تشریف لائے ہیں اور میلاد خواں

بر بنائے عقیدت شریکِ ثواب ہیں۔

تو یارو! بر بنائے ثقافت کسی روایت کو رد کیا تو کیا اور قبول کرلیا تو کیا۔ نماز تو عقیدے کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں جو پیدا ہو جائے وہ کلچر ہے اور جو شخص اگر بتی اور کیوڑے سے مہکتی فضا میں چاندنی پہ دو زانو بیٹھا آنکھیں بند کئے سر نیوڑھائے میلاد خواں کو سن رہا ہے اور جھوم رہا ہے تو وہ اپنی عقیدت میں مگن ہے۔ باقی پرویز صاحب اسے عجمیت کہیں گے اور فیض صاحب اسے ثقافت کی خاطر برداشت کرنے کی کوشش کریں گے۔ آگے شہاب صاحب سوچیں کہ کلچر کی تنظیم نو میں ان روایتوں کو جنھیں نئے دانشور متروک قرار دے چکے ہیں، کس رنگ میں واپس لایا جائے گا۔ مگر شہاب صاحب کو تو ایک فکر اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ تہمبند باندھنے والا آدمی جس بے تکلفی سے دودھ دہی کی دکان میں داخل ہوتا ہے۔ اس بے تکلفی سے آرٹ کونسل میں کیوں نہ آیا جایا کرے۔

شہاب صاحب کا جذبہ نیک ہے مگر یارو ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ کلچر کی اصلاح کے ہر قدم پر کلچر کی دکان کچھ اور اونچی ہو جاتی ہے۔ فیض صاحب کی سرکردگی میں جب کلچرل کمیٹی اس شہر میں وارد ہوئی تو اس نے اپنے دودھ دہی کی دکان ہوٹل انٹر نیشنل میں سجائی۔ وہ دکان اتنی اونچی تھی کہ آرٹ کونسل کی کینٹین میں بیٹھنے والے آرٹسٹوں تک کے لئے وہاں تک رسائی مشکل نظر آئی یعنی دودھ دہی کی دکان کے تھڑے پہ بیٹھنے والا تہمبند پوش آرٹ کونسل سے جتنا دور ہے

اتنا ہی اس کینٹین کی چائے پینے والے آرٹسٹ نے اپنے آپ کو کمیٹی سے دور محسوس کیا۔ بس فرق یہ ہے کہ دودھ دہی کی دکان کے تھڑے پر بیٹھے ہوئے آدمی کے لئے تو آرٹ کونسل مسئلہ نہیں ہے اس لئے کہ جو دودھ دہی سے قریب ہے اس کے لئے کلچر کا قرب و بُعد کیا معنی رکھتا ہے۔ مگر آرٹ کونسل کے بھٹکتے ہوئے آرٹسٹ کے لئے تو کلچرل کمیٹی بہر حال ایک مسئلہ ہے۔ اس لئے کہ دودھ دہی سے تو وہ پہلے ہی دور ہو گیا تھا، اب کلچر بھی اس سے دور ہوتا نظر آتا ہے۔

(۱۹۶۸ء)

پھولوں کا ہفتہ جسے ایک آدمی نے منایا

ہاتھ میں کھرپا، پاؤں مٹی میں سنے ہوئے، پائجامہ نیچے تک اڑسا ہوا۔ وہ شخص اپنے کوارٹر کے سامنے بنی ہوئی کیاری میں زمین کھود رہا تھا۔ اور ایک ننھا سا پودا اجمار رہا تھا۔ ہم نے پوچھا کہ صاحب یہ کیا۔ جواب دیا کہ درختوں کا ہفتہ تو ختم ہو چکا اب میں پھولوں کا ہفتہ مناتا ہوں۔ اور چنبیلی کی قلم لگاتا ہوں۔

یہ کلام سن کر ہمیں پھولوں کی تنہائی کا خیال آیا بے ساختہ دل بھر آیا۔ ہم نے سوال کیا کہ اے عزیز ہم نے چنبیلی کے ساتھ کیا کیا۔ یہ سوال سن کر پہلے وہ ہنسا پھر رو دیا۔ ہم نے پوچھا، اے عزیز تو ہنسا کیوں اور رو دیا کیوں۔ اس نے جواب دیا کہ میں ہنسا یہ سوچ کر کہ چنبیلی کو ہم نے اپنا قومی پھول قرار دیا تھا۔ اور رویا یہ دھیان کر کے کہ چنبیلی ہمارے باغیچوں میں سبزۂ بیگانہ بن گئی۔

صاحبو تم نے اس نیرنگیٔ زمانہ پر غور کیا کہ چنبیلی کے پھول نے ایک ہی وقت میں ہماری آنکھوں دیکھتے کتنی عزت پائی اور کتنی ذلت اٹھائی۔

اب جو پاکستان دیس کے سب پھولوں کا حال ہے وہ بیتیلی کا حال ہے۔ اس شہر میں روز ایک نئی کوٹھی تعمیر ہوتی ہے۔ اور ہر نئی کوٹھی میں پھلواری کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جس کوٹھی میں قدم رکھو وہاں پھولوں کے تختے نظر آئیں گے۔ ان پھولوں کے رنگ تمہاری نظروں کو اپنی طرف مخاطب کریں گے۔ مگر تمہاری قوتِ شامہ سے کوئی کلام نہیں کریں گے۔ وجہ؟ ـ وجہ یہ ہے کہ یہ انگریزی پھول ہیں۔ ان میں رنگ ہی رنگ ہے خوشبو نہیں ہے۔ جیسی تہذیب ویسے اس کے پھول۔ جس تہذیب میں خوشبو نہ ہوگی اس کے پھولوں میں خوشبو کہاں سے آجائے گی۔

خوشبو اب اس شہر میں کہاں ہے۔ کوٹھیوں میں تو نہیں ہے۔ ان کے ڈرائنگ روم مغربی رنگ کے ہیں۔ لان میں انگریزی پھولوں کے تختے ہیں۔ اور ہم نے باغ جناح کے بھی بہت چکر کاٹے۔ کبھی یوں نہ ہوا کہ روش سے گذرتے ہوئے موتیا کی مہک نے تعاقب کیا ہو اور کسی سبزہ زار سے گذرتے ہوئے زعفران رنگ ہارسنگھار سے ملاقات ہوئی ہو۔ باغ جناح اپنی تہذیب کے اعتبار سے آج بھی لارنس باغ ہے۔ تو میر کا مشورہ سر آنکھوں پر کہ ؎

جوں غنچہ میر اتنے نہ بیٹھے رہا کرو
گل پھول دیکھنے کو بھی ٹک اٹھ چلا کرو

مگر کوئی ہمیں بتائے کہ گل پھول دیکھنے ہم کہاں جائیں۔ گل پھول اس شہر میں اب کہاں ہیں۔

چلتے پھرتے ایک کوچے سے گزرے۔ خوشبو نے بڑھ کر ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہم نے اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا۔ نہ کوئی باغ نہ بغیچی۔ یا اللہ پھر یہ مہک کیسی ہے۔ کہ کوچہ طبلۂ عطار بنا ہوا ہے۔ غور کیا تو پتہ چلا کہ یہ تو داتا صاحب کا کوچہ ہے۔ اور اس کنارے سے اس کنارے تک تختوں پر گلاب کے انبار ہیں، اور موتیے کی افراط ہے۔ تو خوشبو اب داتا کے کوچے ہی میں رہ گئی ہے۔ باقی کوچے نئے کوچے ہیں۔ خوشبو سے عاری رنگ سے آراستہ۔ ہم اس کوچے سے نکل کر کہیں گلبرگ جا نکلے۔ ایک کوٹھی میں داخل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ گلاب کے پھول کھلے دیکھے۔ جی خوش ہوا۔ مگر پھر ٹھٹکے۔ ہمارے دماغ میں تو ہنوز داتا دربار کے گلابوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ ہم نے صاحب خانہ سے کہا کہ صاحب کیا بات ہے آپ کے گلاب میں خوشبو نہیں ہے؟ سادگی سے بولے کہ یہ انگریزی گلاب ہے۔

بیلا، چنبیلی، موتیا، مولسری، جوئی، چھوئی موئی، چمپا، گل شبو گل مہندی۔ مگر صاحب پھول جب باغیچوں ہی سے نکل گئے تو حافظے میں ان کے نام اور ان کی مہک کب تک محفوظ رہے گی۔ رنگا رنگ دیسی پھولوں کے نام اب پرانی کتابوں میں تلاش کرو۔ کیا ستم ہے کہ پھولوں سے آشنائی باغیچوں میں نہیں ہوتی۔ اس کیلئے مثنوی گلزار نسیم پڑھنی پڑتی ہے۔

یہ برسات کے دن ہیں۔ گھٹائیں اُمنڈتی ہیں۔ بادل برستے ہیں۔ کبھی ان بھیگے دنوں میں اہلِ ذوق بیلا، چنبیلی، موتیا، چمپا غرض قسم قسم کے پھولوں کی قلمیں

ڈھونڈ کرلاتے تھے۔ اپنی کیاریوں میں لگاتے تھے۔ اب برسات تو ہے مگر بیلا، چنبیلی کی قلموں کی تلاش نہیں ہے۔ وزیرِ زراعت ملک خدابخش صاحب کا محکمہ زراعت درختوں کا ہفتہ منا چکا ہے۔ درختوں کا ہفتہ یہ محکمہ سال میں دو مرتبہ مناتا ہے۔ مگر کبھی ایسا نہ ہوا کہ اس نے پھولوں کا ہفتہ بھی منایا ہو۔ اور گل داؤدی کی نمائش کرنے والوں کو کبھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ چنبیلی کو بھی اپنی انجمن میں شریک کریں۔ آخر چنبیلی پاکستان کا قومی پھول ہے۔ پتہ یہ چلا کہ اس دیس میں جو شے قومی بن جاتی ہے اسے فراموش کر دیا جاتا ہے۔ سو جو اردو کا حال قومی زبان بن کر ہوا وہ چنبیلی کا حال قومی پھول بن کر ہوا

موتیا کی مانگ ابھی باقی ہے۔ ریگل چوک میں، مزنگ چونگی کے موڑ پہ، چیرنگ کراس کے آس پاس موتیا کے گجرے ہنوز شاموں کی رونق ہیں۔ گجرے بیچنے والے گجرے بیچتے نظر آتے ہیں۔ موٹروں والے موٹریں روکتے ہیں اور گجرے خریدتے ہیں۔ مگر انگریزی پھولوں کی یلغار میں موتیا کب تک ٹکے گا، اور کتنے دنوں اور اپنا وقار برقرار رکھے گا۔

(۱۳ اگست ۶۸ء)

اکھاڑے، ادارے اور کُشتیاں

ڈاکٹر وا سطی کو بجا افسوس ہے کہ جوانوں نے کبڈی کھیلنی اور ڈنٹر پیلنے چھوڑ دیئے اور اکھاڑوں سے اُٹھ کر کافی ہاؤسوں اور چائے خانوں میں آبیٹھے۔ ہم اس قومی [illegible] پر ماتم کرتے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شاعر لنگوٹ باندھے کھڑا ہے اور لنگر ہلا رہا ہے۔ یقین نہ آئے تو کراچی کے اردو اخبار دیکھئے۔ وہاں کے ایک اخبار میں شان الحق حقی صاحب کا تعارف بطور ایک شاعر کے کرایا گیا ہے۔ حقی صاحب کی رنگا رنگ دفتری اور گھریلو تصویریں اس تعارف کی زینت ہیں مگر ایک تصویر منفرد ہے۔ اس میں وہ لنگوٹ باندھے کھڑے ہیں اور تصویر کے ذیل میں یہ اطلاع فراہم کی گئی ہے کہ یہ شاعر پہلوانی بھی کرتا ہے۔

شان الحق حقی صاحب کا پہلوان ہونا ہمارے لئے تو خیر کوئی خبر نہیں ہے کم از کم جب سے اُنہوں نے پہلوانِ سخن حضرت جوش ملیح آبادی کو پچھاڑا ہے۔ اس وقت سے تو ان کی پہلوانی اور زور آوری میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں

رہی۔ البتہ ایسے بہت سے لوگ جنہوں نے حقی صاحب کو بس اچکن پہنے اور غزل سناتے دیکھا ہے اس خبر پر ضرور متعجب ہوں گے۔ اصل میں حقی صاحب چور بدن ہیں۔ چور بدن پہلوان چلتے پھرتے دبلے پتلے نظر آتے ہیں۔ مگر جب لنگوٹ کس کے اکھاڑے میں اُترتے ہیں اور بدن پر مٹی ملتے ہیں تو ان کا بدن پھیلتا اور سینہ چوڑا ہوتا نظر آتا ہے۔ اس کے برخلاف حضرت جوش ملیح آبادی بس دیکھنے میں تہمتن ہیں۔ ویسے تو نرے شاعر ہیں۔ ڈاکٹر داسطی آج کے زمانے کو روتے ہیں مگر شاعروں کے بارے میں آج کیا اور کل کیا۔ ہر زمانے میں شاعر بس نرے شاعر ہی رہے۔ اُردو شاعری کی تاریخ میں لے دے کے ایک شاعر کا نام ملتا ہے جو پہلوانِ سخن بھی تھا اور اکھاڑے کا بھی پہلوان تھا۔ یہ شیخ امام بخش ناسخ تھے۔ وہ اکھاڑے میں زور الگ کرتے تھے۔ اور شاعری کے ساتھ زور الگ کرتے تھے۔ اور پہلوانی ناسخ کی طبیعت میں کچھ اتنی راسخ ہو گئی تھی کہ یار لوگوں کو ان کی شاعری پر بھی پہلوانی کا شک گزرنے لگا۔ لفظوں کے ساتھ زور تو خیر جوش صاحب نے بھی بہت کئے ہیں۔ اور گھن گرج والے بڑے بڑے لفظ کو انہوں نے مغلوب کیا اور شعر میں باندھا مگر ناسخ کی طرح شاید اکھاڑے سے ان کا رشتہ کبھی استوار نہیں ہوا۔

ادیب اور شاعر تو اصل میں قلم کے پہلوان ہوتے ہیں۔ مگر زندگی کبھی کبھی انہیں ایسے موڑ پر لا کھڑا کرتی ہے جہاں انہیں سچ مچ کے پہلوان ہونے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ فرانس کے والٹیئر صاحب بہت طنز کے تیر چلاتے تھے۔

مگر کبھی کبھی زخم خوردگان کے نرغے میں آجاتے تھے۔ والٹیئر صاحب تم نے اکھاڑے میں زور کیے ہوتے تب ہی ایسے معرکہ سے سرخرو نکل سکتے تھے۔

روسی ادیب پشکن نے عمر بھر کہانیاں لکھیں یا شعر کہے مگر لڑنی پڑ گئی ڈوئل (DUEL)۔ غریب مارا گیا۔ ایک زور آور مرزا سودا پر بھی قرولی لے کر پل پڑا۔ اور للکارا تھا، کہ تو نے اپنی شاعری سنالی۔ حالا نثرِ من بشنو۔ شاید اسی قسم کے ناخوشگوار واقعات ممتاز حسن صاحب کے پیشِ نظر تھے کہ انھوں نے ایک مرتبہ لاہور میں آ کر رائٹرز گلڈ کے ایک اجتماع میں ادیبوں کو مشورہ دیا تھا کہ شاعری کی زور آوری برحق مگر تھوڑی ورزش بھی کیا کرو۔

اِن واقعات سے یہ گمان نہیں کرنا چاہیئے کہ ادیب اور شاعر نرے مٹی کے مادھو ہیں۔ کوئی آئے اور انھیں پچھاڑ جائے۔ ادیبوں اور شاعروں کے اپنے اکھاڑے ہیں اور اپنے داؤ پیچ ہیں۔ ڈاکٹر واسطی تو محض کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس سے واقف ہیں۔ بے شک اس عہد کے یہ بھی بہت بڑے اکھاڑے ہیں۔ ادیب یہاں بیٹھ کر بڑی بڑی کشتی لڑتے ہیں۔ ٹی ہاؤس میں ہم نے دیکھا ہے کہ یہاں کبھی ادب کے نام پر اور کبھی سوشلزم کے نام پر مستقل ہی زور ہوتے رہتے ہیں جو زور نہیں کرتے کم از کم بدن پر مٹی ملے ضرور بیٹھے رہتے ہیں۔ مگر ٹی ہاؤس تو ایک اکھاڑہ ہے بچائے خانوں کے سوا بھی تو اکھاڑے ہیں۔ ادب اور زبان کے نام پہ قائم ہونے والے ادارے اور انجمنیں بھی تو اپنے اپنے طرز کے اکھاڑے ہی ہیں۔ اور ٹی ہاؤس تو

اناڑیوں کا اکھاڑہ ہے۔ زور زیادہ ہوتے ہیں، داؤں پیچ کم استعمال ہوتے ہیں۔ مگر اداروں میں بیٹھے ہوئے پہلوان داؤں پیچ کے ماہر ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ حریف اڑنگے میں آجائے پھر اسے چت ہوا سمجھو۔

اِس رنگ سے ہٹ کر پہلوانی اور شاعری کا اجتماع اس زمانے میں کم نظر آتا ہے۔ شان الحق حقی اور محمد علی کلے کی بات اور ہے وہ باکسر بھی ہیں شاعر بھی ہیں۔ اور اپنے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کے اعتبار سے انقلابی بھی ہیں۔ ان کے بارے میں ہم آپ کیا کہیں گے۔ ایک فن کے متعلق سدھ بدھ رکھتے ہیں تو دوسرے فن میں کورے ہیں۔ دوسرے فن کے بارے میں کچھ جانتے ہیں تو تیسرے فن سے نابلد ہیں۔ صفدر میر ہی کچھ کہیں تو کہیں کہ وہ بھی ہر سہ اوصاف سے متصف ہیں۔ البتہ ایک بات ہم کہیں گے وہ یہ کہ محمد علی کلے داؤں پیچ کی سب حسرتیں باکسنگ رنگ میں نکال دیتے ہیں۔ دنیائے شاعری میں آکر انھیں داؤں پیچ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس لئے شاعری ان کے ہاتھوں میں محفوظ ہے۔ شاعری کے لئے خطرہ وہاں ہوتا ہے جہاں شاعر داؤں پیچ کی سب حسرتیں شاعری ہی کے اکھاڑے میں نکالتے ہیں۔ اس کشتم کشتا میں ہم نے تو یہی دیکھا کہ شاعروں کا کچھ نہیں بگڑتا، شاعری چت ہو جاتی ہے۔

(۱۹۶۸ء)

اُردو ادب کے نئے صوفی جشنِ فرید میں

جدھر جاؤ ادھر ایک جشن برپا نظر آتا ہے۔ اسی گہما گہمی میں جشنِ فرید بھی آگیا۔ لاہور میں یہ جشن اخباری مضامین تک محدود رہا۔ ہم اس جشن کی خوشبو لیتے لیتے ملتان پہنچ گئے۔ وہاں قاسم باغ میں مجمع خاص و عام دیکھا۔ سروں کا سمندر امنڈتا دیکھا۔ اس جشن میں حضرت خواجہ غلام فرید کو خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا تھا۔ ان کی کافیاں گائی جاتی تھیں۔ موسیقار دور و نزدیک سے آئے ہوئے تھے۔ کچھ ایسے عوامی موسیقار دیکھے جنھوں نے اپنا فن خواجہ فرید کے لئے وقف کر دیا ہے۔ انھیں کے شعر گاتے ہیں اور مست رہتے ہیں۔ کچھ ان فن کاروں کو دیکھا اور سُنا جن کا نام شہر شہر مشہور ہے۔ خمیسو خاں کو سُنا۔ نذیر بیگم، ثریا ملتانیکر، روبینہ اور تاج ملتانی کو سُنا۔

یہ محفل جاری تھی کہ شکیل بدایونی کی غزل کا اعلان ہوا۔ اس اعلان پر ہم چونکے۔ مگر بہرحال اعلان ہو چکا تھا اور شکیل کی غزل گائی جارہی تھی۔ ہم نے اہلِ

جشن سے کہا کہ صاحب اگر آپ کو قومی یک جہتی کی خاطر اُردو غزل کو درمیان میں لانا ہی تھا اور اردو غزل اور سرائیکی کافی کے درمیان یک جہتی پیدا کرنی ہی تھی تو اس کے لئے شکیل بدایونی تک جانا کیا ضروری تھا۔ یہ یک جہتی تو خود خواجہ فرید اپنی شاعری میں پیدا کر گئے ہیں۔ ان کی کوئی غزل اس محفل میں ہو جاتی۔ اہل جشن بولے کہ صاحب یہ بات ذہن سے اُتر گئی۔ ورنہ ہمارے پاس خواجہ کی اردو غزلیں بھی محفوظ ہیں۔

بہر حال جشنِ فرید والوں نے فرید کی کافی میں شکیل کی غزل کا ٹانکا لگایا مگر ہم فرید کی کافی میں فرید ہی کی غزل کو پیوند کرتے ہیں۔ ان کی چند غزلیں ملتان کے جشنِ فرید والوں کی طرف سے ہمیں بھی کسی زمانے میں دستیاب ہو گئی تھیں۔ ایک غزل کے چند اشعار سنئے۔ ؎

بت کے ہر ناز کو میں رازِ خدا کا سمجھا
اس کے دشنام کو اعجازِ مسیحا سمجھا
میں نے ہر قطرے کو دریا سے زیادہ سمجھا
ذرے کے نور کو خورشید سے بالا سمجھا
مَے پرستی میں مرے دل کی ترقی دیکھو
خم گردوں کو مَیں اک ادنےٰ سا پیالا سمجھا
عشق بازی میں مرا مرتبہ ایسا ہے فریدؔ
قیس بھی مجھ کو گرو، آپ کو چیلا سمجھا

دوسری غزل ملاحظہ فرمایئے۔ ؎

ایسے دردوں میں مبتلا ہیں ہم
گویا عینِ غم و بلا ہیں ہم
بن گئے ہیں جہاں سے بے گانہ
جب سے اس بت سے آشنا ہیں ہم
جور اتنا کرو نہ میرے پر
اے بتو، بندۂ خدا ہیں ہم
دیر و کعبہ میں دل نہیں لگتا
یار کے در کے جُبّہ سا ہیں ہم
خواب میں بھی نہیں ہے وصل نصیب
بے نصیبوں کے پیشوا ہیں ہم
جیسے ہیں اُس کے ہیں، وہی جانے
گرچہ ناچیز و ناسزا ہیں ہم
ہمسر بسر عاشقِ خدا ہوں فرید
عشق مخلوق سے جدا ہیں ہم

٭

ایک اور غزل کے چند شعر دیکھئے :۔

ے

ہر اک ساعت میں سو طرزیں جفا کی
ستم کی، شرط بازی کی، دغا کی
سمندر سا ہوں خوش نارِ جفا میں
قسم ہے اُس جفا جُو کی جفا کی
میں جتنا چاہتا ہوں وصل، ہے ہجر
عجب اُلٹی ہیں تاثیریں دعا کی
نہیں کوئی جسے کاٹا نہ ہو گا
یہ ناگن دیکھئے زلفِ دوتا کی
رہوں گا انتہا تک ہمدمِ غم
مری یہ آرزو ہے ابتدا کی

صاحبو، بات یہ ہے کہ خواجہ فرید آجکل کے دانشوروں میں سے نہیں تھے، کہ علاقائی تہذیب ان کے لئے خود مختار تہذیب بن جاتی۔ ملتانی میں اپنا بھرپور اظہار کرتے کرتے اگر وہ اردو کے کوچے میں نکل جاتے ہیں یا فارسی کے علاقے میں داخل ہو جاتے ہیں تو اس کے ایک معنی ہیں۔ علاقائی تہذیب ان کے لئے خود مختار تہذیب نہیں تھی۔ بلکہ ایک وسیع تر تہذیبی وحدت کا حصہ تھی۔ الگ الگ علاقوں میں بیٹھے ہوتے صوفی شعراء علاقائی زبانوں میں شعر کہہ کر علاقائی خود مختاری کا اعلان نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ علاقوں کو اس عظیم تہذیبی وحدت میں

پرونے کی کوشش کر رہے تھے۔ جس کا برِ عظیم میں اب پاکستان امین ہے۔ تو یہ شعراء قومی یک جہتی کے نشان ہیں نہ کہ قومی تفریق کے۔ اب اگر نئے دانشور نے درآمد شدہ فلسفوں کے زور پر ان سے اُلٹے معنی مرتب کرلیں تو یہ الگ بات ہے۔

خیر تو ذکر جشنِ فرید کا تھا۔ اِس جشن کا ایک رنگ یہ تھا کہ یہاں نئے صوفی بھی جمع تھے۔ یعنی وہ صوفی جو آسمانِ ادب پر افسانہ نگار بن کر چمکے۔ مگر پھر جب بہت دنوں تک ہم نے ان کا افسانہ نہ پڑھا تو یاروں سے پوچھا کہ ہمارے وہ محبوب افسانہ نگار کہاں گئے۔ جواب ملا کہ وہ اب صوفی ہو گئے۔ تو یوں سمجھو کہ جشنِ فرید میں ممتاز مفتی بھی تھے اور قدرت اللہ شہاب بھی تھے۔ رہے ابنِ انشاء، تو ہم نے ڈاکٹر عبادت بریلوی کی گاڑی سے ان پر قیاس کیا تھا۔ عبادت صاحب کی گاڑی واگہ کے رستے میں خراب ہوئی تو انہوں نے یہ کہا کہ میری گاڑی تو لمبے رن کے لیے بنی ہے۔ ان کے اس بیان کو ابنِ انشا لے اڑے۔ بات یہ ہے کہ ابنِ انشاء خود بھی تو لمبے رن کے لئے بنے ہیں۔ اِس لئے بیٹھے بیٹھے ان کا سنگاپور کی طرف نکل جانا تو ہماری سمجھ میں آتا ہے مگر وہ تو رکے تڑکے منہ اندھیرے مفتی صاحب اور شہاب صاحب کے پیچھے پیچھے مزاروں تک کیوں گئے یہ ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ مگر پھر ہم یہ سوچ کر چپ ہو گئے کہ ع

گو مشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

(۱۲ نومبر ۱۹۸)

رائلٹی سے کبوتروں کا خرچ پورا نہیں ہوتا

جشنِ فرید سے متعلق کالم کے بارے میں ایک ادب دوست نے ہمیں شکایتاً مطلع کیا ہے: "جشنِ فرید پر آپ نے کالم لکھا ہے یا مقالہ رقم کیا ہے۔ خواجہ فرید کی اردو غزلیں قومی یک جہتی کی دلیل سہی لیکن ان پر الگ تنقیدی مضمون لکھا جا سکتا تھا۔ آپ کا کالم اصل میں وہاں سے شروع ہونا چاہیے جہاں وہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور آخر ابن انشا، قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی کے علاوہ ادیب بھی تو تھے جنہوں نے اس تقریب میں شرکت کی تھی۔ کیا وہ یکسر نظر انداز کر دینے کے لائق تھے۔"

صاحب جشنِ فرید کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں خلقت بھی بہت تھی۔ موسیقار بھی بہت تھے اور ادیب بھی بہت تھے۔ اس کا سیدھا سیدھا احوال آپ سننا چاہتے ہیں تو یہ ہے کہ افتتاحی جلسہ میں صدارت قدرت اللہ شہاب صاحب نے کی تھی۔ ایثار راعی صاحب نے سپاسنامہ پڑھا۔ پھر ایثار راعی صاحب کو سپاسنامے میں

ایسی لذت ملی کہ جشن کے ہر جلسہ میں سپاسنامہ پڑھتے چلے گئے۔ بزمِ ثقافت کے سیکرٹری ریاض انور صاحب نے موسیقی کی محفلوں میں اعلانات کر کے وہ لذت حاصل کی جو ایثار راعی صاحب نے سپاسنامے کے ذریعے حاصل کی تھی۔ مگر اعلانات کرتے کرتے ان کے جوشِ عقیدت اور زورِ بیان میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہوگیا۔ خمیسو خاں کی آمد کا اعلان کرتے کرتے انہوں نے جوشِ عقیدت میں اعلان کیا کہ وہ دن دور نہیں جب آپ ان لوگوں کو ڈھونڈا کریں گے جنہوں نے خمیسو خاں کا نغمہ سنا ہے۔ اس پر یاروں نے ایک دوسرے کو تشویش کی نظروں سے دیکھا۔ اور کہا کہ یارو شیطان کے کان بہرے کہیں خمیسو خان نے تو یہ بیان نہیں سُن لیا۔ مگر خمیسو خان تو اُن فنکاروں میں سے ہے جو اپنے فن میں ایسے مگن رہتے ہیں کہ باقی باتوں کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔

مذاکرے میں قومی یکجہتی کے مسائل درپیش تھے۔ رحیم الدین، میرزا ادیب، جمیل ملک اور شہزاد احمد وغیرہ وغیرہ نے مقالے پڑھے اور اسی مسئلہ کے الگ الگ پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ واضح رہے کہ وغیرہ وغیرہ میں شہزاد احمد کو شمار کرنا مقصود نہیں۔ اسی خانے میں آپ ہمیں ڈال لیں۔ مائک کے سامنے کھڑے ہو کر مقالہ پڑھنے کی نازک گھڑی بھی کبھی کبھی ہم پر آ ہی جاتی ہے۔

اس مذاکرے کی صدارت وزیر زراعت ملک خدا بخش بچہ کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ جس تاریخ نے پاکستان کو جنم دیا ہے اس کا بنیادی پتھر اسلام ہے۔

اس حوالے سے ملتان میں رہنے والے کا حق جتنا ملتان پر ہے اتنا ہی راجشاہی پر ہے اور راجشاہی میں رہنے والے کا جتنا حق راجشاہی پر ہے اتنا ہی ملتان پر ہے۔

کوی جسیم الدین کو اس پر اصرار تھا کہ بنگلہ ادب کے اُردو میں ترجمے ہونے چاہییں۔ اور اُردو ادب کے بنگلہ میں ترجمے ہونے چاہییں۔ ادبی سطح پر فکر و احساس کا یہ تبادلہ ہی قومی یکجہتی کا ضامن بن سکتا ہے۔ مگر کیا قیامت ہے کہ ہماری تحریریں انگریزی میں تو ترجمہ ہو گئیں مگر اُردو میں ترجمہ ہو کر مغربی پاکستان کے لوگوں تک نہیں پہنچ سکیں۔

باقی ادیبوں نے جلسہ کی بات جلسہ کے ساتھ نبٹا دی مگر کوی جسیم الدین نے اپنی مہم کو اس کے بعد بھی جاری رکھا۔ انہوں نے ہاتھ کے ہاتھ ناصر کاظمی کی ایک غزل سُن کر اسے بنگلہ میں ترجمہ کر کے اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ پھر پوچھا کہ تمہیں اپنی کتابوں کی ماہانہ رائلٹی کتنی مل جاتی ہے۔ ناصر کاظمی نے اس پر اپنا سر کھجایا اور کوی جسیم الدین نے اپنے ماہانہ اخراجات کی تفصیل پیش کی اور کہا کہ میرا ماہانہ خرچ کل ملا کر دو ہزار روپے ہوتا ہے اور یہ سب میری کتابوں کی رائلٹی سے پورا ہوتا ہے۔

اس پر ناصر کاظمی بہت افسردہ ہوئے اور بولے کہ میری رائلٹی سے تو میرے کبوتروں کے دانے کا بھی خرچ پورا نہیں ہوتا۔ اور ناصر کاظمی نے اپنے کبوتروں کے اخراجات گنائے اس سے ہم نے یہ نتیجہ مرتب کیا کہ اس شاعر کا

اصل خرچ کبوتروں کے دانے پانی کا خرچ ہے اور اگر اس نے ملازمت کر رکھی ہے تو اپنے کبوتروں کی خاطر کر رکھی ہے۔ بھوک تو آدمی کی تقدیر ہے۔ کبوتروں کو تو بھوکا نہیں رکھا جا سکتا۔

ابنِ انشاء ناصر کاظمی کو دیکھتے تھے اور کہتے تھے کہ ناصر کاظمی واقعی قلندر ہو گیا ہے شاعری، ادب اور دنیا کے جھمیلوں سے منہ موڑ لیا ہے۔ بس اب اسی لئے کبوتروں سے لَو لگا رکھی ہے۔

ویسے تھوڑی سی قلندری کا رنگ تو سب ہی ادیبوں نے اپنی روش میں پیدا کر رکھا تھا اور ممتاز مفتی تو مانے ہوئے قلندر ہیں۔ اچھا تو بس جمیل ملک بنے ہوئے تھے۔ ان کی ثقاہت، ان کے رکھ رکھاؤ، ان کے لباس کی نفاست کو ممتاز مفتی نے بہت ہی برداشت کیا مگر آخر ضبط نہ کر سکے اور بولے کہ "یار جمیل ملک لباس وغیرہ میں ہر وقت اتنا تکلّف نہ کیا کرو۔ تھوڑا اپنے آپ کو آزاد بھی چھوڑ دو۔"

جمیل ملک بولے کہ "اسی اہتمام کے باعث تو میری صحت برقرار ہے اور میری عمر بڑھ گئی ہے۔"

مُفتی صاحب اس پر بہت چپ ہوئے مگر پھر بولے کہ "اپنے آپ کو تھوڑا آزاد چھوڑ دو تو تمہاری عمر اور بڑھ جائے گی۔"

ادھر یہ گفتگو ہو رہی تھی اور ادھر صہبا لکھنوی ملتانی دریاں خریدنے کے لئے اور ناصر کاظمی کبوتر خریدنے کے لئے بازار جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

(۱۹۸۴ء)

اور بلّی کا بچّہ سو رہا تھا

اُونچی چھت پر صبح کی دھوپ میں بلّی کا بچّہ دھوپ سینک رہا تھا، اور صحافی جمع ہو رہے تھے۔ صحافی جمع ہوتے رہے اور بلّی کا بچّہ پاؤں پسارے دیکھتا رہا۔ پھر جلسہ شروع ہوا۔ صحافیوں نے گرم تقریریں شروع کر دیں۔ بلّی کے بچّے نے کہا کہ صحافی جاگ چکے ہیں۔ مجھے سو جانا چاہیئے اور وہ سو گیا۔

صحافی تقریریں کرتے رہے اور بلّی کا بچّہ سوتا رہا۔ جلسہ ختم ہوا۔ صحافی سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگے اور جلوس مرتب کرنے لگے۔ بلّی کا بچّہ صبح کی نرم دھوپ میں اطمینان سے سو رہا تھا۔

صحافی جب الفلاح کے سامنے سے گذر رہے تھے تو ہمیں ایک کہاوت جو کبھی بچپن میں سُنی تھی۔ بہت یاد آئی۔ ؎

رُڑکی شہر بڑا نرالہ نیچے ندی اوپر نالہ

پس منظر اس کا یہ ہے کہ رڑکی شہر میں نیچے ندی بہتی ہے اس کے اُوپر پُل

بنا کر ایک نہر گذاری گئی ہے۔ جسے انجینئرنگ کا ایک کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ ویسے اب یہ کارنامہ میلسی کے مقام پر پاکستانی انجینئر بھی انجام دے چکے ہیں۔ انجینئرنگ کا یہی کارنامہ الفلاح کے سامنے شاہراہ قائداعظم پر بھی انجام پایا۔ صحافیوں کی لمبی قطاریں چلی جارہی تھیں جیسے دریا بہتا ہے۔ رستے میں بے روزگاروں کا ایک ننھا سا جلوس آ گیا۔ یہاں سخت خطرہ تھا کہ صاحب روزگار صحافی اور بیروزگار مظاہرین آپس میں خلط ملط ہو جائیں گے۔ مگر بیروزگار اپنی جگہ پر چوکنے تھے اور روزگار سے لگے ہوئے صحافی اپنے مقام پر محتاط تھے۔ پس صحافیوں کے قائدین ہمایوں ادیب اور اشرف طاہر نے سلیقہ سے کاوا کاٹا اور بیروزگاروں سے بال بال بچ کر اسمبلی کی طرف نکل گئے۔

جب صحافیوں کا جلوس پنجاب یونیورسٹی کے سامنے سے گذر رہا تھا تو ایک طالبعلم نے جلوس میں شامل ایک صحافی کو تعجب سے دیکھا اور کہا کہ یہ تو ہمارے کالج میں استاد تھا، صحافی کیسے ہو گیا۔

یہ صحافی مسعود اللہ تھے۔ جن کے متعلق کسی دانشور نے کیا خوب کہا ہے کہ وہ صحافی برادری کا احمد مشتاق ہے۔ مسعود اللہ نے طالبعلم کا فقرہ سنا اور اپنے ساتھ چلتے ہوئے صحافی سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے بارے میں یہ CONFUSION قائم رہے۔

چنانچہ اس صحافی کے بارے میں یہ CONFUSION بعد میں بھی قائم

رہا۔ اسی راہ سے دو گھنٹے بعد جب ادیبوں کا جلوس نکلا تو فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے ایک کباڑی نے اسے حیرت سے دیکھا اور کہا کہ عجب بات ہے۔ دو گھنٹے پہلے یہ شخص اسی راستہ سے گذرا تھا۔ اس وقت وہ صحافی تھا۔ اب ادیب ہے۔

ویسے کباڑی کے اس اعتراض کا اطلاق اس روز اور بہت سے دانشوروں پر بھی ہو سکتا تھا۔ صحافیوں کے جلوس میں ادیب اور ادیبوں کے جلوس میں صحافی بالعموم رلے ملے نظر آئے۔ پاکستانی ادب کی تاریخ میں صحافت اور ادب آپس میں اس عوامی شان کے ساتھ گڈ مڈ پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ پریس کلب کی چھت پر جہاں بلی کا بچہ سو رہا تھا۔ وہاں ایک ادیب کھڑا بڑے جوش میں کہہ رہا تھا کہ ادب کی کوئی ایسی تعریف نہیں ہے جس کے تحت میں اور مسعود اللہ بیک وقت ادیب قرار دیئے جا سکیں۔ اس اعلانِ نفاق کے باوجود یہ دونوں شخص بیک وقت صحافیوں کے جلوس میں بھی موجود پائے گئے اور ادیبوں کے جلوس میں بھی دیکھے گئے۔

ایک ادیب سے کسی نے پوچھا کہ تمہیں تو ادیبوں کے اس جلوس پر اعتراض تھا۔ تم یہاں کیسے موجود ہو؟ اس نے کہا کہ میں نے یہ سوچا کہ جب ادیبوں کا جلوس نکل ہی رہا ہے تو اس میں کوئی ادیب بھی ضرور ہونا چاہیئے۔

صفدر میر نے زندگی میں پہلی مرتبہ آج اس بات کا اہتمام کیا کہ ادب اور صحافت کو گڈ مڈ نہیں ہونا چاہیئے۔ پس صحافیوں کے جلوس میں چلتے ہوئے انہوں نے زور شور سے نعرے لگائے۔ جب ادیبوں کے جلوس میں شامل ہوئے تو

اظہار کی علامتی صورتوں پر آگئے اور احمد ندیم قاسمی کے پیچھے خاموش چلتے رہے۔
صحافیوں کے جلوس میں مختلف نعرے سُنے گئے۔ پھر یکایک ایک نعرہ بلند ہُوا۔ "نعرۂ تکبیر۔ اللہ اکبر"۔ ہم نے آگے بڑھ کر نظر ڈالی تو وہ صفدر میر تھے۔ ہم نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ جنگِ ستمبر کا مسلمان ہنوز مسلمان ہے۔ پھر یہ بھی جانا کہ صفدر صاحب موقع کی مناسبت سے نعرہ لگانا جانتے ہیں۔

جب جلوس گول باغ میں جاکر تمام ہوا تو فریدہ حفیظ کے لئے یہ مسئلہ پیدا ہُوا۔ کہ ان کے ہاتھ میں جو اتنے بہت سے پھولوں کے ہار ہیں ان کا وہ کیا کریں۔ اتنے میں صفدر میر نے جلوس کا آخری نعرۂ تکبیر بلند کیا، فریدہ حفیظ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بڑھ کر سارے ہار صفدر صاحب کے گلے میں ڈال دیئے

تب صفدر صاحب کو مزید جوش آیا اور اُنھوں نے مزید نعرے بلند کئے۔
موقعہ غنیمت جان کر ہم نے بھی اپنے ہار صفدر صاحب کے گلے میں ڈال دیئے اور ان سے اپنا نعرہ لگوایا۔

کتنے صحافیوں کے جلوس میں بھی اچھی خاصی تعداد میں تھے اور ادیبوں کے جلوس میں بھی خاصی تعداد میں تھے۔ مگر ادیبوں کے جلوس کے کتنے نئی شاعری والی افراتفری کے شکار تھے۔ صحافیوں کے جلوس کے کتنے صحافیوں کے مقاصد کی زیادہ وضاحت سے نشان دہی کر رہے تھے۔ پھر ہر صحافی کے سینے پر سیدھا نثر میں لکھا ہُوا ایک بلا لگا تھا۔ "ہمارا مطالبہ آزادئ صحافت"۔ بعد میں یہی بلا

ادیبوں کے جلوس میں تقسیم ہوا۔

صحافیوں کے جلوس میں ایک کتبہ کا مضمون قائدِ اعظم کا یہ بیان تھا۔ " جو سچ سمجھو وہی لکھو۔ خواہ اس سے تمہارا قائدِ اعظم ہی ناراض ہو جائے "

ہم نے اس کتبہ کو بصد احترام وردِ زبان کیا۔ اور سوچا کہ ایسی بات یا تو والٹیر کہہ سکتا تھا یا قائدِ اعظم کہہ سکتے تھے۔ یہ کتبہ ہم نے ادیبوں کے جلوس کے ہمراہ بھی دیکھا۔ اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ کہ ادیبوں کے جلوس کا کم از کم ایک کتبہ تو ادبی عظمت کا حامل ہے۔

صفدر میر سے کوئی صاحب استفسار کر رہے تھے۔ کہ اب تو نظم لکھی ہو گی۔ صفدر صاحب نے کہا۔ ہاں لکھی ہے۔ تب وہ یوں بولا کہ صفدر صاحب سے شعر کہلوانے کے لئے بہت اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ جنگ نہیں تو جلوس کا اہتمام کیا جائے ــــ،

ایک دوست نے ہمیں آ کر خبر دی کہ تم فلاں فلاں نوجوان غزل گو کو طعنہ دیتے تھے کہ تمہارا سیاسی شعور ٹی ہاؤس کی میز پر بکھرا نظر آتا ہے۔ غزل تخالص لکھتے ہو۔ مگر اس مرتبہ اس نے سیاسی شعور کی حامل غزل بنائی ہے۔

ہم نے پوچھا کہ بھائی یہ واقعہ ہے یا افواہ ہے۔؟ وہ بولا کہ واقعہ ہے تب ہم نے کہا کہ تمہارے منہ میں گھی شکر۔ اب ہم ناصر کاظمی کو جا کر مبارکباد دیں گے کہ لڑکا بالغ ہو گیا ہے۔ مونچھوں کا کونڈا کرو +

(۱۲/۱۲/۶۸، ۱۳)

ادیبوں کے پیچھے پیچھے سیاست کے کھونٹے تک

نئے برس کے آغاز کی تقریب سے ہم نے بیان کیا کہ پاکستان کے ادیبوں اور دانشوروں نے ۱۹۶۸ء کیسے گذارا اور ۱۹۶۹ء کیسے گذاریں گے۔ مگر کل ایک دوست نے ہمیں گریبان سے پکڑا اور کہا کہ تمہاری قیافہ شناسی کی قلعی کھل گئی۔ ہم نے کہا وہ کیسے۔ کہا کہ جب تم یہ پیش گوئی کر رہے تھے کہ ترقی اردو بورڈ کے موجودہ ڈائرکٹر اشفاق احمد بورڈ کے ڈائرکٹر ہی رہیں گے، پیپلز پارٹی میں شامل نہیں ہوں گے۔ اس وقت بورڈ کے سابق ڈائرکٹر اے۔ ڈی اظہر صاحب پیپلز پارٹی سے رخصت ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

بات یہ ہے کہ ہماری دوڑ تو کلچر تک ہے۔ کلچر کے جو ستارے گردش کرتے کرتے سیاست کے برج میں داخل ہو گئے ہیں وہ ہماری زد سے باہر ہیں۔ سیاست کے علاقہ میں داخل ہونے والے دانشوروں کے بارے میں ہم قیاس آرائی کر سکتے تو سب سے پہلے تو ہم اپنے یار حنیف رامے کے بارے میں قیاس کے گھوڑے

دوڑاتے۔ لیکن ہمیں ایک فقیر نے نصیحت کی تھی کہ سب کھونٹ جانا مگر سیاست کے کھونٹ مت جانا۔ اب اگر ہم کبھی اس علاقے کے آس پاس گھومتے نظر آئیں تو یہ سمجھا جائے کہ ہم اس علاقے میں جا بسنے والے دانشور دوستوں کی خیریت معلوم کرتے گئے ہیں۔ وہاں جا بسنے والے دانشور دوستوں کی صورت یہ ہے کہ ہمارے یار حنیف رامے وہاں گئے اور بھٹو صاحب کے محمد حسنین ہیکل بن گئے۔ حبیب جالب نیپ کے قصوری گروپ کے میکسیم گورکی قرار پائے۔ بھاشانی گروپ سی آر اسلم گروپ، میجر اسحٰق گروپ کے اپنے اپنے گورکی ہوں گے۔ لیکن وہ نمایاں نہیں۔ پھر ہر پھیر کے سارے انقلابی گروپ اسی ایک گورکی سے کام چلاتے ہیں۔ سی آر اسلم گروپ کا بھی اپنا ایک شاعر تھا تو سہی مگر بدقسمتی سے وہ نیا شاعر تھا اس لئے اس کی شاعری کی مارکیٹ ٹی ہاؤس تک تھی۔ مگر اب ہم نے یہ خبر پڑھی کہ یہ شاعر بھی سرک کر پیپلز پارٹی میں چلا گیا۔ یوں سمجھیے کہ پیپلز پارٹی میں اے ڈی اظہر صاحب جیسے کہنہ مشق شاعر کے نکل جانے سے جو خلا پیدا ہوا تھا، اسے نئے شاعر مبارک حیدر نے پُر کیا ہے۔

عجب بات یہ ہے کہ تحریکِ جمہوریت کے پاس کوئی دانشور نہیں ہے۔ کم از کم اس معاملہ میں اس کی تقدیر کنونشن لیگ سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ دانشور تو خیر وہاں ہوں گے مگر ہماری مراد دانشور کے اس برانڈ سے ہے جسے نیا دانشور کہتے ہیں۔ یہ مخلوق نیپ کے علاقوں میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ وہاں سے

نکلتی ہے تو چرتی چگتی پیپلز پارٹی کے مرغزار میں پہنچ جاتی ہے۔ جماعت اسلامی سے
اس مخلوق کا اینٹ کتے کا بیر ہے۔ اس لئے تحریکِ جمہوریت کا علاقہ اس کے لئے
چراگاہ نہیں بن سکتا۔ اس لئے اگر اے۔ ڈی اظہر صاحب اس علاقے میں آ نکلے
تو تحریکِ جمہوریت والوں کو چاہیے کہ انھیں غنیمت جانیں۔ اور اللہ عزیز کر کے
سنگھوا لیں۔ ویسے ہم نے کراچی کے ایک اخبار میں یہی پڑھا ہے کہ مقامی
تحریکِ جمہوریت نے ان کے مستعفی ہونے کی خبر دی ہے۔

خبر یوں ہے کہ مقامی تحریکِ جمہوریت کی طرف سے اعلان ہوا ہے
کہ اے۔ ڈی اظہر صاحب نے پیپلز پارٹی سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔
انہوں نے یہ فیصلہ اس پارٹی کی طرف سے صدارتی انتخابات میں حصہ لینے کے فیصلہ
کے خلاف احتجاج کے طور پر کیا ہے۔ لیکن اگر صدارتی انتخابات میں حصہ لینے کے
خلاف ہی فیصلہ مقصود تھا تو اسے اے۔ ڈی اظہر صاحب کو پیپلز پارٹی سے باہر
جانے کی مطلق ضرورت نہیں تھی۔ پیپلز پارٹی کے اندر ہی وہ فارورڈ بلاک کی طرف
سرک جاتے۔ وجہ اصل میں اور ہے۔ پیپلز پارٹی نوجوانوں کی آماجگاہ ہے۔ اور
یوں تو اے۔ ڈی اظہر صاحب بھی اپنے تیور نوجوانوں ہی کے سے رکھنے کی کوشش
کرتے ہیں۔ مگر نوجوان انھیں نوجوان تسلیم نہیں کرتے۔ تو اگر وہ اس گلی سے اٹھ
آئے تو انھوں نے اچھا ہی کیا۔ تحریکِ جمہوریت والے سمجھ رہے ہیں کہ انھوں
نے پیپلز پارٹی کا ایک دانشور اچک لیا ہے اور اس طرح اس پارٹی کو زک پہنچائی

ہے۔ ویسے یہ تو آگے چل کر پتہ چلے گا کہ اس لین دین میں زک کسے پہنچی ہے۔

ایمان کی کہیں گے۔ یوں تو اس وقت بہت سے دانشور پر پرزے نکال رہے ہیں۔ اور مختلف شاعر بقدرِ ہمت و توفیق انقلابی شاعری کر رہے ہیں مگر حبیب جالب پھر حبیب جالب ہیں۔ ؎

ہزار شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

سیاسی شاعری کی ٹرافی حبیب جالب لے گئے۔ یار لوگوں نے تو موسم کے ساتھ پھیری لی ہے۔ اب سوچ رہے ہیں کہ رنگِ یگانہ سے بات نہیں بنے گی۔ اب مشکل یہ آپڑی ہے کہ حبیب جالب کا رنگ اختیار کرتے ہوئے شرماتے ہیں اس لئے کہ انھوں نے حبیب جالب کو بڑا شاعر کبھی مانا ہی نہیں۔ خود کوئی راہ نکالنے کی سکت نہیں رکھتے۔

غزل گویوں کی تو یہ مشکل ہوئی۔ نئی شاعری والوں کی اپنی مشکلات ہیں۔ قبولِ عام کی سند حاصل کرنے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ بات قبولِ عام کے امکانات رکھا کرے۔ لفظ بھی تو کسی کے پلے پڑیں۔ اب وہ یہ بھی عذر نہیں کر سکتے کہ نظم آزاد غزل کی طرح روایتی صنفِ سخن نہیں ہے۔ کہ لوگ اسے لے اڑیں۔ صفدر میر فوراً دلیل پیش کرتے ہیں کہ میں نے جنگ کے زمانے میں دو نظمیں نظمِ آزاد کے اسلوب میں لکھیں اور قبولِ عام کی سند حاصل کی۔ ہاں

ہم نے پیش گوئی کی تھی کہ صفدر میر اس برس پھر ایک نظم لکھیں گے۔ دوسری پیش گوئی اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اس نظم پر صرف داد ہم دیں گے۔ بات یہ ہے کہ ع

ہر روز عید نیست کہ حلوہ خورد کسے

اور پاؤں کے نیچے روز روز بٹیر نہیں آیا کرتی۔ بلکہ کہنے والے تو حبیب جالب کے بارے میں یہی کہتے ہیں کہ نیپ کے پاؤں کے نیچے تو بٹیر آ گئی ہے۔ باقی جماعتیں منہ دھو رکھیں۔

(۱۷/۱/۶۹)

ہنگامہ خیز دنوں سے سنسان دنوں تک

ہم نے پوچھا کہ اے عزیز تو نے کرفیو کے شب و روز کو کیسا پایا۔ اُس نے جواب دیا کہ صاحب داستان میری یہ ہے کہ میں رات بھر جاگا کیا اور دن بھر سوتا رہا۔ سوتے سوتے کئی بار اٹھا۔ دروازے کی کنڈی کھولی۔ گلی میں جھانکا۔ گلی اس کنارے سے اس کنارے تک سنسان ویران۔ پھر واپس آکر چادر تان لی۔

ع   دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ غنودیم

اس عزیز کی زبان سے سرمد کا یہ مصرعہ سن کر ہم حیران ہوئے کہ یا اللہ کیا کرفیو اگلے زمانے میں بھی لگا کرتے تھے۔ یہ سوچتے تھے کہ ہمیں کسی استاد کا شعر یاد آیا ؎

قدغن ہے کوئی باغ میں یاں آنے نہ پائے
اور آبھی سکے یاں پہ تو پھر جانے نہ پائے

مگر استاد سے بہت پہلے میرا بائی نے کہا تھا ؎

گلی تو چاروں بند ہوئی
میں ہری ہے ملوں کیسے جائے
کوس کوس پہ پہرہ بیٹھا
(چوتھا مصرعہ نظر انداز کیا گیا)

اور میر اور میرابائی سے بہت بعد غالب نے احوال یوں بیان کیا ؂

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

کرفیو کسی نہ کسی وقت تو ٹوٹتا ہی ہے مگر غالب جیسے لوگ کرفیو ٹوٹنے پر بھی خوش نہیں ہوتے۔ ؂

میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

ہجراں کا داغ مٹانے کے لئے اور خفقانی طبیعتوں کو بہلانے کے لئے گھروں میں مقید یاروں نے عجب عجب جتن کئے۔ کسی نے بسنت کی بچی کھچی ڈور اور پتنگ سنبھالی اور چھت پر چڑھ گیا۔ کسی نے گھر کی الماریاں جھاڑیں اور جیسی کیسی کتاب ہاتھ پڑ گئی اسے پڑھتا چلا گیا۔ کسی بوڑھے نے حقہ گرم کیا۔ بچوں کو جمع کیا اور گذرے زمانوں کے کرفیو یاد کر کے داستانیں سنانی شروع کر دیں۔

مگر ایک دیدہ ور نے کرفیو کے سارے منظر کا خلاصہ یوں کیا کہ بوڑھی عورتوں نے پان کی بجائے لسوڑے چبائے اور راوی پل کے کنارے دن میں گیدڑ بولے۔

کرفیو کے وقت میں وقفہ کیا آیا دریا کا بند ٹوٹ گیا۔ یا یہ کہ کابک کے پٹ کھل گئے۔ جو ہے وہ گھر سے نکل پڑا ہے بلکہ ابل پڑا ہے۔ اور اڑا چلا جا رہا ہے جیسے گھر، گھر نہ ہوئے زنداں ہو گئے ہیں اور اب کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے لوگ گھروں سے نکلے ہوئے ہیں اور سڑکوں پر امڈے ہوئے ہیں۔ جسے جو سواری ملی وہ اس میں سوار چل پڑا۔ جسے سواری نہ ملی وہ پیدل ہی سٹ پٹ کرتا روانہ ہوا۔ سڑکوں پر ایسی سراسیمگی ہم نے کبھی کاہے کو دیکھی تھی۔ سواریوں

کی ریل پیل میں سواری سواری کے ساتھ الجھ گئی۔ ٹریفک کے گرداب بن گئے۔ رستے بند ہو گئے۔ اور ہم نے یہ بھی منظر دیکھا کہ ٹریفک کا سپاہی غائب ہے۔ پبلک میں سے کوئی نوجوان کرسی چوراہے پر ڈال کر کھڑا ہو گیا اور ٹریفک کو ہدایت دینے کے فرائض انجام دینے لگا۔

ترکاری کی دوکانوں پر ہجوم الگ، دال چاول کی دوکانوں پر ہجوم الگ۔ یہ ہجوم اپنی دال روٹی کا بندوبست کر رہا تھا۔ مگر ایک ہجوم وہ بھی تھا جو وقت گذاری کے انتظامات کر رہا تھا۔ کوئی مونگ پھلی، چلغوزے خرید تا تھا، کوئی مانجھا پتنگ کا انتظام کرتا، کوئی آنہ لائبریری کی طرف لپکا چلا جا رہا تھا۔

ایک نکڑ پر ہم نے یہ منظر دیکھا کہ نیچے بھیڑ بکریوں کا ریوڑ کھڑا ہے اور اوپر درخت پر گڈریا ان پڑھا ہے۔ اور جلدی جلدی پتے توڑ کر نیچے پھینک رہا ہے۔ اور بھیڑ بکریاں جلدی جلدی پتے چبا رہی ہیں۔ آخر بھیڑ بکریوں کا اپنا بھی تو وجدان ہوتا ہے کیا انھیں کرفیو کی سنگینی کا احساس نہ ہوگا ــــ ، کہتے ہیں کہ ایک گڈریا کرفیو پاس کی درخواست لے کر پہنچ گیا اور کہا کہ مجھے چراگاہ جانے کا پاس دیا جائے۔ مگر کرفیو پاس جاری کرنے والے ضابطہ کے خلاف تو کوئی کام نہیں کر سکتے۔ جواب دیا کہ اے گڈریئے تیرا کام ESSENTIAL SERVICES کے تحت نہیں آتا۔ ستم ظریف گڈریئے نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ میری بھیڑیں بھو کی مر گئیں تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا۔

(۳۰ ۱/۶۹)

ن۔م راشد کے ساتھ دو شامیں

انھیں ہنگامہ خیز دنوں میں اس شہر میں ایک شاعر نے بھی ورود کیا۔ اس صدی کی چوتھی دہائی میں اردو میں نئے ادب کی جو تحریک شروع ہوئی تھی اس میں نئی نظم کے ائمہ تین مانے گئے تھے۔ ن۔م راشد۔ میراجی اور فیض۔ ان تینوں شاعروں نے لمبے لمبے سفر کیے۔ فیض صاحب کا معاملہ تو یہ رہا کہ انھوں نے بے شک سفر کیے۔ کبھی ماسکو کے کبھی لندن کے مگر پھر واپس آگئے۔ سو وہ ہماری تمہاری نظروں سے اوجھل نہیں ہو پاتے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب ان کا ذکر شاعری کے حوالے سے نہیں بلکہ سیاسی معاملات و مسائل کے حوالے سے سنا جاتا ہے۔ میراجی نے اس ملک کا سفر کیا جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا کرتا۔ سفرِ امریکہ سفرِ ملکِ عدم تو نہیں ہے۔ مگر آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل —— اور ن۔م راشد یونیسکو کی تقریب سے نیویارک میں رہے یا تہران میں رہے بہرحال پاکستان سے دور رہے اور ہماری تمہاری نظروں سے اوجھل رہے۔ اب جو

وہ اس شہر میں وارد ہوئے اور پہلے حلقۂ اربابِ ذوق میں اور پھر پاکستان کونسل میں نمودار ہوئے تو ان کا آنا ایک واقعہ بن گیا۔

حلقۂ اربابِ ذوق کی محفل بھی بہت بھری پُری تھی اور پاکستان کونسل میں بھی ہم نے اتنا مجمع کم موقعوں پہ دیکھا ہے۔ اس مجمع میں ایسے نئے شاعر بھی پائے گئے۔ جنھوں نے پچھلے دس برسوں میں سر اٹھایا اور اپنی نئی شاعری کے پرچم کو راشد اور میراجی کی نئی شاعری کے پرچم سے اونچا کر کے ٹی ہاؤس میں سجایا۔ مگر بہرحال اس وقت انھوں نے اپنا پرچم لپیٹا ہوا تھا۔ راشد صاحب نے حلقہ میں اپنی نظم سنائی اور افتخار جالب نے خراجِ تحسین پیش کیا کہ یہ وصف غالب کی شاعری کا تھا کہ غور و فکر کے ساتھ اس کے شعر میں معنی کی نئی نئی تہیں ابھرتی آتی ہیں۔ غالب کے ساتھ اُردو شاعری سے یہ وصف رخصت ہو گیا۔ اب سو سال کے بعد راشد کی نئی نظم کے ساتھ یہ وصف پھر اُردو شاعری کو میسّر آیا ہے۔ اس نظم کی یہی کیفیت ہے کہ غور و فکر کے ساتھ اس میں معنی کی تہیں اُبھرتی آتی ہیں۔

افتخار جالب کے اس تنقیدی محاکمہ نے ٹی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے نئے شاعروں کے حلقہ میں بہت ہیجان پیدا کیا۔ جاننا چاہیے کہ ٹی ہاؤس کے حلقے اے ڈی سی سے زیادہ خوش نہیں ہیں۔ یہ علاقہ بھٹو صاحب کے اثر میں ہے۔ اسی لئے حبیب جالب بھی یہاں طنز و تعریض کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔ بس ایک نئے شاعر نے یہ محاکمہ سُن کر اعلان کیا کہ افتخار جالب صاحب نئی شاعری کے نوابزادہ نصراللہ خان

ہیں۔ وہ راشد صاحب سے جن مذاکرات میں مصروف ہیں ان میں میں شامل نہیں ہوں گے۔ بہر حال راشد صاحب بھی ان ادیبوں میں نہیں ہیں جو اپنے بعد میں آنے والوں کو گردانتے ہی نہیں۔ انھوں نے پاکستان کونسل میں اپنی نظمیں پڑھنے کے بعد جو چند مختصر باتیں کیں ان میں نئی پود والی نئی شاعری کو بہت سراہا۔ اور جلسہ تمام ہونے کے بعد افتخار جالب کی شاعرانہ حیثیت کا یہ کہہ کر اقرار کیا کہ اب افتخار جالب بھی پرانوں میں شامل ہیں۔

اس فقرے نے دو حلقوں میں دو قسم کے ردِ عمل پیدا کیے۔ ایک پختہ فکر اور پختہ مذاق لوگوں کا حلقہ جو افتخار جالب کو بطور شاعر گردانتا ہی نہیں تھا۔ اور ان کی نظموں کو ہنسی میں اڑا دیتا تھا۔ ان لوگوں نے بڑے تعجب سے راشد صاحب کی بات سُنی اور کہا کہ اچھا تو ہمیں اب اس ژولیدہ گو کو بھی شاعر ماننا پڑے گا۔

نوجوانوں کے حلقہ میں یہ فقرہ شاعر کے خلاف گیا۔ ایک نے جل کر کہا کہ میں تو پچھلے ایک سال سے افتخار جالب کی کنپٹی پر ایک سفید بال دیکھ رہا ہوں۔ اب معاملہ صاف ہے۔ گیا وہ پرانی نسل میں۔

سیدھی صاف بات یہ ہے کہ آدمی کھلی فضا میں سانس لے یا گنبد میں بند ہو کر بیٹھ جائے۔ وقت تو بہر حال گذرتا ہے۔ بس دس سال ٹی ہاؤس کے اندر بھی گذرے ہیں جو نوخیز ۱۹۵۸ء میں یہاں داخل ہوئے تھے رفتہ رفتہ ان کی مسیں بھیگیں، سبزہ خط نے نمود کی۔ پھر انھوں نے ملازمتیں کیں، شادیاں کیں۔

دنیا کے اچھے بُرے میں شامل ہوئے۔ آیئڈیلزم رخصت ہوا۔ زندگی کی مصلحتیں سمجھ میں آیئں اور عجیب نئی پود ادب میں کوئی بامعنی ہنگامہ پیدا کیے بغیر ہی دیکھتے دیکھتے پرانی نسل کی دہلیز پر آکھڑی ہوئی۔

اب راشد صاحب کے بارے میں سنیے۔ اُنھوں نے ایک نظم حلقہ اربابِ ذوق میں سنائی۔ بہت سی نظمیں پاکستان کونسل جاکر سنائیں۔ اس لئے کہ حلقہ میں کسی کی شام بلا شرکتِ غیرے نہیں ہوتی۔ یہاں ان کے دو شریک اور بھی تھے۔ شریکِ غالب نہ سہی مگر تھے تو شریک۔ ایک اعجاز حسین بٹالوی تھے۔ جنھوں نے غالب کے ایک مقدمے کی رُوداد سنائی۔

پاکستان کونسل میں وہ ہی وہ تھے۔ انہوں نے پہلے اپنی نظمیں سنائیں پھر قیوم نظر کے اصرار پر اور بار بار کے سوال پر چند باتیں کہیں۔ ان سے پوچھا گیا تھا کہ اپنی نظموں کے پس منظر پر روشنی ڈالیے۔ انہوں نے کہا کہ اب سے پہلے جب چاندنی رات اور برسات وغیرہ کے عنوان قائم کرکے نظمیں لکھی جاتی تھیں تو شاعر کے لئے اپنی نظم کا پس منظر بیان کرنا بہت آسان تھا۔ اب صورت یہ ہے کہ تجربات پیچ در پیچ ہوتے ہیں۔ پس منظر اتنا سیدھا اور صاف نہیں ہوتا کہ اسے چند لفظوں میں بیان کر دیا جائے۔ یہ پس منظر نظم ہی سے جس حد تک واضح ہو سکتا ہے ہوتا ہے

قیوم صاحب نے سوال کیا کہ آپ کو 'ماورا' اور 'ایران میں اجنبی' سے نظمیں سنانے پر تامل تھا۔ آخر کیوں؟ جواب دیا کہ 'ماورا' کی نظمیں اب مجھے

بچپن کے کھلونے نظر آتی ہیں۔

راشد صاحب کو اصرار تھا کہ اب جو وہ شاعری کر رہے ہیں وہ 'ماورا' اور 'ایران میں اجنبی' کی شاعری سے مختلف ہے۔ وہ کہتے تھے کہ شاعر کے لئے اپنے آپ کو دہرائے چلے جانا مشکل ہے۔ کم از کم میرے لئے یہ بات آسان نہیں ہے۔ میری کوشش یہ رہتی ہے کہ جس تجربے کو ایک وقت میں بیان کر چکا ہوں اسے دہرایا نہ جائے۔

آنسو گیس سے غالبؔ کی شاعری تک

باہر آنسو گیس کے گولے پھٹ رہے تھے اور اندر بحث گرم تھی کہ غالبؔ نے 'کاش کہ' لکھا ہے یا 'کاشکے' باندھا ہے۔

یہ صورت حال عجیب نظر آتی ہے مگر کیا کیا جائے کہ وہ دن ہی عجیب تھا۔ ہڑتال کا دن تھا۔ سب دکانوں کے ساتھ ساتھ ادب کی دکان بھی بند تھی۔ جو اور کوچوں کا احوال تھا ادب کے کوچے کا بھی احوال تھا۔ ہم کہیں دوپہر کو چلتے پھرتے ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس کے علاقے میں پہنچے۔ اس وقت اس کوچے کا دفتر بہت ابتر تھا۔ جا بجا کھڑی ہوئی پولیس کے غضب ناک تیور صورتِ حال کی سنگینی کی غمازی کر رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ یا اللہ ہم کہاں جائیں۔ ٹی ہاؤس تو بند پڑا ہے۔ اسی سراسیمگی میں ہم نے ایک چور دروازہ دریافت کیا اور ٹی ہاؤس کے اندر جا پہنچے۔ چائے خانہ تو بند ہی تھا۔ مگر اکا دکا دانشور نے وہاں پناہ لے رکھی تھی۔ بس جیسے ہم آئے ویسے ہی یار لوگ یہاں آتے چلے گئے۔ کوئی پریس رپورٹر جلوسوں کو دیکھتا بھالتا، پولیس سے

بچتا بچاتا اندر تک آیا۔ کسی دوسرے رپورٹر نے ساتھی کا سراغ لگا لیا اور پیچھے پیچھے چلا آیا۔ پھر کسی فوٹوگرافر نے موقعہ واردات پر کوئی تصویر کھینچی اور اپنا کیمرہ دبا کر یوں بھاگا جیسے چور چوری کر کے بھاگتا ہے۔ وہ بھی اسی طرف نکل آیا۔ پھر کوئی وکیل ہائیکورٹ میں بسی ہوئی آنسو گیس سے پریشان ہو کر اس ایوانِ عالی سے مثلِ بوئے پریشاں کے نکلا اور آنکھیں پونچھتا یہاں آ پہنچا۔

یہاں جو آیا تھا پریشان ہی آیا تھا۔ اور شروع میں ہر پارٹی کی زبان پر وہ تھا جو وہ ابھی ابھی دیکھ کر آ رہا تھا۔ مگر بات قیامت سے چلی اور جوانی تک پہنچی۔ کسی نے سوال اٹھایا کہ صاحب یہ پوسٹ آفس والوں نے غالب کا شعر کیا غلط سلط چھاپ ڈالا ہے ؎

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
کاش کہ پرے ہوتا عرش سے مکاں اپنا

کسی نے پوچھا کہ صاحب اس میں غلط کیا ہے۔ معترض نے کہا کہ 'کاش کہ' غلط ہے۔ غالب نے تو 'کاشکے' لکھا ہے۔ اس اعتراض نے یاروں کو سنبھلنے نہ دیا تھا کہ دوسرا معترض بولا کہ 'کاش کہ' اور 'کاشکے' کی بحث بعد میں آتی ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا غالب نے 'پرے' باندھا ہے۔ میں نے معتبر نسخوں میں 'ادھر' پڑھا ہے۔

بحث بڑھتی چلی گئی اور الجھتی گئی۔ گلی کی اینٹ، سڑک کا روڑا، بھان

متی نے کنبہ جوڑا۔ رپورٹر، فوٹوگرافر، وکیل اور ہم جیسے کالم نگار سب ہی شاعری کے مزاج داں بنے ہوئے تھے۔ اپنے دوست خالد حسن رپورٹری کرتے کرتے ۱۴ فروری کے اس سنگین لمحہ میں ڈاکٹر وحید قریشی کی اقلیم میں درّانہ داخل ہو گئے تھے اور ثابت کر رہے تھے کہ اصل میں غالب نے "کاشکے" لکھا تھا اور شہرت بخاری اور انجم رومانی اپنے شاعرانہ تجربے سے اس تحقیق کو کمک پہنچا رہے تھے۔ مگر مخالف صف میں اعجاز حسین بٹالوی تھے۔ انھیں کم مت جانو۔ وقتاً فوقتاً وہ بھی اپنے آپ کو محقق ثابت کرتے ہیں۔ آخر وہ لندن آتے جاتے رہتے ہیں۔ برٹش میوزیم ڈاکٹر وحید قریشی کے لئے شنید ہے اعجاز حسین بٹالوی کے لئے دید ہے۔

باہر سے ایک دانشور آیا۔ آنسو پونچھتا ہوا، اپنے حواس سنبھالتا ہوا۔ بحث کرنے والوں نے اس کی پریشان حالی دیکھی، اپنی بحث ملتوی کی۔ پوچھا "کیا حال ہے"۔

دانشور بولا "بہت بُرا حال ہے۔ میں ریگل سے آرہا ہوں بس پوچھو مت"۔

رنگِ محفل اچانک بدل گیا۔ باہر کے ابتر نقشہ پر کچھ تبادلۂ خیال ہوا۔ تھوڑا غصہ، تھوڑا ہراس۔ پھر کسی دانشور نے کہا کہ "ہاں تو میں یہی کہہ رہا تھا کہ 'کاش کہ' میں 'کہ' بیانیہ ہے۔ اسے الگ ہی لکھنا چاہیئے"۔

شہرت بخاری کو سخت غصہ آیا۔ بولے کہ "'کاشکے' اور 'کاش کہ' میں املا کا نہیں بلکہ معنی کا فرق ہے"۔

غالب پر بحث پھر شروع ہوگئی۔ مگر بیٹھے ہوؤں میں سے کبھی ایک کبھی

دوسرا اُٹھ کر باہر جاتا تھا اور جھانک کر چلا آتا تھا۔ باہر کی دنیا اندر کی دنیا پر اثر انداز ہو رہی تھی اور علمی بحث میں خلل پڑتا چلا جا رہا تھا۔ اور شہزاد احمد اور ان کے ساتھی پریشان تھے کہ کہیں ان کا اوکاڑے کا رستہ کھوٹا نہ ہو جائے۔ اوکاڑے کے اہلِ مذاق کو بھی غالب کی یاد میں محفل آج ہی منعقد کرنی رہ گئی تھی۔ یہ وہ محفل تھی جس میں ملتان کے کمشنر صاحب مہمانِ خصوصی تھے۔ اور فیض صاحب کہ آج کی بزمِ شعر کے مہمانِ خصوصی ہیں مہمانِ عمومی تھے۔

مسافر ایک ایک کر کے اپنے اپنے سفر پر جانے لگے۔ جنھیں اوکاڑہ جانا تھا وہ اوکاڑہ چلے گئے۔ رپورٹروں کو یاد آیا کہ وہ کس کام پر نکلے تھے اور کس کام میں پھنس گئے ہیں۔ وہ جس آشوب سے نکل کر یہاں آئے تھے پھر اسی آشوب کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ہم نے دیکھا کہ اعجاز حسین بٹالوی بھی غائب ہیں۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ وہ مردِ تن آساں اپنی موٹر سے ہم جیسے تن آسانوں کے کام آئے گا۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ اس بھلے مانس نے ہم جیسے تن آسانوں کو ڈھونڈنے کی بجائے موقعہ واردات سے ایک زخمی کو اٹھایا اور ہسپتال تک پہنچایا۔

ادھر ہم نے اُٹھتے اٹھتے یہ طے کیا کہ پوسٹ آفس والوں کو خواہ مخواہ ہدفِ ملامت بنایا جا رہا ہے۔ 'کاشکے' میں 'کے' بیانیہ ہے کہ اب کاش کے ساتھ اس کا استعمال متروک ہے۔ اور 'کاشکے' پرانا املا ہے۔ غالب کو نقل کرتے ہوئے نقل کرنے والے پرانا املا ترک کرتے ہیں اور نیا املا لکھتے ہیں۔

اس لیے 'کاش کہ' درست ہے۔ باقی محقق جانیں، اور ہمیں تو اودھر سے زیادہ 'پرے' ہی بھلا لگتا ہے۔ باقی یہ بھی محقق ہی جانیں کہ غالب نے 'پرے' لکھا تھا یا 'ادھر' لکھا تھا۔

باہر نکلے تو شہر لاہور کا ابتر مرقع مزید ابتر ہو گیا تھا۔ جو نظر آیا ہراساں نظر آیا۔ جسے دیکھا اس کے حواس تتر بتر دیکھے۔ اور آپ سوچتے ہوں گے کہ ہائے ان کم بختوں کو غالب کس وقت یاد آیا۔ مگر موت کا وقت معین ہے۔ شاعر کے یاد آنے کا کوئی وقت معین نہیں ہے۔ شاعر عجب عجب رستوں پر آ کر رستہ کاٹتا ہے۔

ویسے غالب تو خود بھی منجملۂ اسباب ویرانی ہے۔ وہ تو ایسے موقعوں پہ یاد آتے ہی آتے۔ آنسو گیس، لاٹھی چارج، فائرنگ، غالب کی شاعری غرض غم ہستی میں تو سب ہی کچھ شامل ہے۔ ہم کس غم کو فراموش کریں اور کس غم کو یاد کریں۔ غم بہر صورت ہے۔ شمع کبھی یوں جلتی ہے کبھی دوں جلتی ہے۔ مختصر یہ کہ سحر ہونے تک ہر رنگ میں جلتی ہے۔

(۱۸ ۲/۶۹)

کیا کیا اُن نے سلوک کئے ہیں شہر کے عزّت داروں سے

زمانہ کچھ اس تیزی سے بدلا کہ کل کے بہت سے واقعات یکایک ماضی کی داستان بن گئے۔ یار لوگ کہتے ہیں کہ چھوڑ دجی رات گئی بات گئی۔ مگر ایک سانحہ ایسا ہے جس کا ان دنوں علمی اور ادبی حلقوں میں بہت چرچا ہے۔ ہم جس محفل میں گئے یہی ذکر دیکھا۔ ایک محفل میں باتیں کرتے کرتے ایک دانشور نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا کہ "دس سالہ دورِ ترقی میں علم و دانش کی رسوائی یوں بھی ہوتی تھی"۔

جانتے ہو یہ سانحہ کیا تھا اور جاتے ہوئے زمانہ نے جاتے جاتے کیا شگوفہ چھوڑا تھا۔ ہوا یوں کہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں کو چارج شیٹ دیا گیا۔ صبح ہم نے یہ خبر پڑھی اور شام ہوتے ہوتے یہ خبر سنی کہ ملک میں مارشل لاء نافذ ہو گیا۔

مارشل لاء کی خبر جب رفتہ رفتہ ہمارے شعور کا حصہ بن گئی تو پھر ہمیں ڈھیرے ڈھیرے وہ واقعات اور سانحے یاد آئے جو اس خبر میں دب کر رہ گئے

تھے۔ اور ہم نے ایک استعجاب سے یاد کیا کہ دس سالہ دَور کے آخری دن کیا عجب خبر آئی تھی۔ محکمۂ تعلیم کی ستم ظریفی دیکھو کہ اس نے سابق گورنر جناب محمد موسیٰ کو الوداع کہتے کہتے آخری لمحہ میں کون سے حکم پر دستخط کرائے اور اس بزرگ کی سادگی پر غور کرو کہ اس نے کس مستعدی سے اس حکم پر دستخط کئے۔ اگر اس بزرگ کو اس قوم کی علمی روایات کا کسی قدر پاس ہوتا تو اس کا قلم اس حکم پر دستخط کرتے ہوئے ضرور ٹھٹھکتا۔ اب لوگ دانتوں میں انگلیاں دابتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صاحب ایسا تو کبھی انگریزوں کی محکومی کے زمانے میں بھی نہ ہوا تھا کہ کسی وائس چانسلر کو چارج شیٹ دیا جاتا۔

ایک معاشرے کو ہم یوں بھی جانچتے ہیں کہ اس میں علماء و فضلا کا کیا درجہ ہے۔ اور ایک عہد کے زریں یا تاریک ہونے کا، دَورِ ترقی یا دورِ تنزل ہونے کا ہم یوں بھی اندازہ لگاتے ہیں کہ اس میں علم و دانش کی روایات سے کیا سلوک کیا گیا۔ ہمیں اپنی تاریخ کے ایسے دور بھی یاد ہیں جب مطلق العنان بادشاہوں کے باوجود علماء، صوفیا اور شعراء اپنے وقت کے بادشاہ تھے اور وقت کے حاکم ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے۔ پھر ایسے دَور بھی یاد ہیں جب مطلق العنانوں نے اپنی طاقت کے زعم میں علماء و فضلاء کی تذلیل کی۔ مگر ایسا دور جو بھی گذرا ہے اسے ہم جبر کے دور کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ یہ ذکرِ تاریخِ قدیم کا ہے۔ کوئی لازم نہیں کہ پرانی تاریخ نئی تاریخ میں

بھی اپنے آپ کو دہراتی نظر آئے۔ تاہم ایسے مختلف سبق ہیں جو فراموش نہیں ہونے چاہئیں۔ اور علم و دانش کی توہین اور تذلیل کسی بھی دور میں ہو بادشاہت کے دور میں ہو آمریت کے دور میں ہو یا جمہوریت کے دور میں ہو۔ بہرحال قومی زوال کی نشانی قرار پائے گی۔ یونیورسٹیاں ہمارے تمہارے زمانے میں نمائندہ علمی ادارے ہیں۔ ان اداروں کے سائے میں علم و فضل اور ادب و فن کی روایات پھلتی پھولتی ہیں اس لئے ان اداروں سے ایک مخصوص وقار وابستہ ہے۔ ان اداروں کی سربراہی کے لئے دیکھ بھال کر ایسی شخصیتوں کو چُنا جاتا ہے جن پر دستارِ فضیلت آراستہ ہو جاتی ہے۔ تو ان کی پوری عزت و تکریم کی جاتی ہے۔ یونیورسٹی کا وائس چانسلر تو ایک پوری علمی روایت کا امین ہوتا ہے۔ اب اگر کسی یونیورسٹی پر یہ نوبت آجائے کہ علمی مرتبہ سے قطع نظر کر کے جسے جی چاہا وائس چانسلر کی مسند پر بٹھا دیا جس سے ناخوش ہوئے اسے مسند سے اتار دیا، جس سے بہت خفا ہوئے اس پر فردِ جرم عائد کر دی اور جواب طلب کر لیا۔ تو اس سے نہ صرف یونیورسٹی کی رسوائی ہے بلکہ پاکستان کی پوری علمی روایت کے ساتھ خرابی ہے۔

ویسے جب ہم نے یہ خبر سُنی کہ پروفیسر حمید احمد خاں پر فردِ جرم عائد ہو گئی تو ہمیں بہت تشویش ہوئی۔ سوچتے تھے کہ ہم خانصاحب کو کیا سمجھتے تھے اور وہ کیا نکلے۔ کوئی بہت ہی سنگین جرم کیا ہوگا جو یہ نوبت آئی۔ ورنہ وائس چانسلر سے جواب طلب کرنے اور فردِ جرم عائد کرنے کی کب کسی محکمہ کو جرأت ہوتی

ہے۔ مگر جب ہم نے الزامات کی فہرست پڑھی تو پہلے ہم روئے اور پھر ہم ہنسے۔ کسی نے پوچھا کہ اے عزیز تو کیوں رویا اور کیوں ہنسا۔ ہم نے جواب دیا کہ: "اے شخص ہم روئے یہ دیکھ کر کہ اب علم و فضل پر اس ملک میں یہ وقت آ گیا ہے کہ محکمے اس سے جواب طلبیاں کرتے ہیں۔ ہنسے اس لئے کہ ہمیں مرغ اور بلّی کی حکایت یاد آ گئی"۔

اس شخص نے پوچھا کہ مرغ اور بلّی کی حکایت کیا ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ اے شخص وہ حکایت یوں ہے کہ ایک بلّی نے مرغ کو دبوچ لیا مگر بلّی تھی قانون دان۔ اس نے سوچا کہ مرغ کو دبوچ تو لیا مگر اس کے کھانے کا کوئی قانونی جواز بھی تو ہونا چاہیئے۔ تب بلّی نے مرغ پر فردِ جرم عائد کی کہ وہ روز صبح کو سوتے والوں کی نیند میں خلل ڈالتا ہے۔ اس کی بانگ کا سلسلہ ختم ہونا چاہیئے۔ اور یہ کہہ کر اس کی گردن مروڑ دی"۔

خیر وائس چانسلر صاحب پر جو چارج شیٹ لگا وہ عہدِ گزشتہ کا کارنامہ ہے مگر اب جو کچھ ہوگا وہ موجودہ عہد سے منسوب کیا جائے گا۔ علمی حلقوں میں ہم نے یاروں کو یہ قیاس آرائیاں کرتے دیکھا ہے کہ اب علم و دانش کی روایات کے بارے میں روش مختلف ہوگی اور علمی اور تہذیبی ادارے جس طرح اس پچھلے دور میں افسر شاہی کے زیرِ نگیں آ گئے تھے اس سے انھیں نجات ملے گی۔ علم و تہذیب کی قلمرو میں اہلِ علم اور اہلِ ہنر ہی کی افسری چلے گی۔

یہ قیاس آرائیاں سن کر ہم نے سوچا کہ اگر یوں ہے تو پھر وائس چانسلر صاحب کے ساتھ ساتھ محکمۂ تعلیم کے بارے میں بھی تحقیق ہونی چاہیئے کہ اس نے اس صوبے میں تعلیم کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اور پاکستان کی علمی روایات کے ساتھ کیا کیا۔

(۸ ۲/۶۹)

بارش، اولے، رخصتی اور نیند

پھر بارش ہوئی اور پھر اولے پڑے اور پھر بارش ہو گئی اور پھر اولے پڑ گئے۔ منگل کی صبح ہم نے امنڈتی گھٹاؤں میں کی۔ بادل گرج رہے تھے۔ کچھ کالے کالے کچھ پیلے پیلے۔ پہلے گرجے پھر برسے۔ مینہ پڑا، مینہ کے ساتھ اولے پڑے۔ بوندوں کے ساتھ اولوں کا ریلا آیا اور گزر گیا۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر بوندوں اور اولوں کا ریلا پھر آ گیا۔ یوں سمجھو کہ اولوں والا مینہ تین بار پڑا۔ باقی بوندوں کا ہم نے شمار نہیں کیا۔

یارو یہ تو بیساکھ کا مہینہ ہے پھر ساون بھادوں کی صورت کیسے پیدا ہوئی۔ اور ساون بھادوں تو ساون بھادوں کے وقت ہی اچھے لگتے ہیں بیساکھ کے مہینے میں آ جائیں تو پھر موسم کا قوام بگڑ جانے کی صورتیں ہیں۔ گرمی کا قوام تو اب کے ایسا بگڑا ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔ چار دن جہاں سورج تیز چمکا پانچویں دن گھٹا امنڈ آتی ہے۔ چھٹے دن بارش آ جاتی ہے۔ اور یار لوگ تہہ کر کے رکھے ہوئے جاڑوں

کے کپڑے پھر نکال لیتے ہیں۔ لگتا ہے کہ گرمی میں طاقتِ قرار نہیں رہی۔

مگر ایک ستم ظریف نے عجیب بات کہی۔ بولا کہ صاحب اب تو بارشیں بھی سیاسی رنگ اختیار کر گئی ہیں۔ جب کوئی ڈیگال مسندِ اقتدار سے اُترتا ہے تب بارش ہوتی ہے۔ رخصت ہونے والے ڈیگال بارش اور اولوں کے سائے میں رخصت ہوتے ہیں۔ بارش جو پاکستان میں ہوتی فرانس میں بھی ہو رہی تھی۔ فرانس سے آنے والی خبر یہ کہتی ہے کہ بارش ہو رہی تھی اور جنرل ڈیگال سو رہے تھے۔ صاحب سونے والے یوں بھی سوتے ہیں اور ڈیگال صاحب تو اس شب گھوڑے بیچ کر سوئے اصل میں اُنھوں نے اپنے صدارت کے گھوڑے کو داؤ پر لگایا تھا۔ ادھر بازی ہار رہی تھی ادھر ڈیگال صاحب پیرس سے نکل کر اپنی بستی میں آ گئے۔ گھر کی ساری بتیاں بجھائیں اور شمع کشتہ کی طرح پڑ رہے۔ ادھر وہ اپنے گھر میں منہ اندھیرے چادر تانے سو رہے تھے ادھر بستی والے اپنے اپنے منہ لپیٹے خراٹے لے رہے تھے۔ لگتا تھا کہ سب ہی گھوڑے بیچ کر سوئے ہیں۔ بارش ہو رہی تھی اور بستی سو رہی تھی۔

شہرت شبِ فراق ہے جی بھر کے سوئیے

ہاں ایک آنکھ بیدار تھی۔ یہ اس اندھیرے گھر کا پاسباں تھا وہ ہاتھ ملتا تھا اور کہتا تھا۔ "واحسرتا، واحسرتا۔ زمانہ بدل گیا"

بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ پاکستان کی بات کرتے کرتے دفعتاً زقند لگا کر فرانس میں جا نکلنا کچھ محمد حسن عسکری ہی کو زیب دیتا ہے۔ ہماری دوڑ تو لاہور

سے لاہور تک ہے۔ مگر ہماری بات چھوڑیئے۔ فرانس کی طرف زقند تو سب ہی لگاتے رہے ہیں اور دانشوروں نے رشک کی نظر سے دونوں ہی بزرگوں کو دیکھا۔ ژاں پال سارتر کو بھی اور آندرے مالرو کو بھی۔ سارتر کی طرح آندرے مالرو بھی نامی گرامی ادیب ہیں۔ ایک وقت میں ان کی بہت دھوم تھی۔ جنرل ڈیگال کے برسرِ اقتدار آنے پر وہ ان کے حامی بن گئے۔ پہلے مشیر بنے اور پھر وزیر بنے۔ ادھر امریکہ میں کینیڈی کے برسرِ اقتدار آنے پر وہاں کے ایک دانشور نے زور باندھا۔ یہ پروفیسر گلبرتھ تھے جو کینیڈی کے مشیر اور ایلچی بن گئے۔

پاکستان کے دانشوروں نے یہ دیکھا اور ہاتھ ملے کہ فرانس اور امریکہ میں دانشوریوں بامِ عروج پر جگمگائیں اور ہم کہ اپنے ملک کے مالرو اور سارتر اور گلبرتھ ہیں یوں خراب حال رہیں۔ ایک پروفیسر صاحب نے سچ مچ اِن خطوط پر پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ اور بالائی حلقوں تک یہ بات پہنچائی کہ اس بیسویں صدی میں مملکتوں کے نظام دانشوروں کے بل پر چلا کرتے ہیں اور اگر آپ غور کریں تو ایک پروفیسر گلبرتھ یہیں کہیں آپ کے آس پاس بھٹک رہا ہے۔ یہ بات بہت کہی گئی اور بہت لکھی گئی مگر قسمت نے یاوری نہیں کی اور پاکستان کا کوئی پروفیسر پروفیسر گلبرتھ نہ بن سکا۔

باقی رہا ژاں پال سارتر کا معاملہ تو سارتر صاحب یہاں کے ادبی حلقوں میں مقبول ہوتے ہی چلے گئے۔ آخر رائٹرز گلڈ نے سوچا کہ ایک مرتبہ سارتر صاحب

کو بلا ہی لیا جائے اور پاکستان میں ان کی رونمائی کرا دی جائے۔ انھیں سالانہ اجلاس میں شرکت کا دعوت نامہ بھیج دیا گیا۔ اور تصور کر لیا گیا کہ جس طرح اردو کا شاعر دعوت نامہ ملتے ہی مشاعرے میں دوڑا ہوا جاتا ہے اسی طرح سارتر صاحب بھی گلڈ کے ادبی اجتماع میں دوڑے چلے آئیں گے۔ اب گلڈ کی مجلس عاملہ میں یہ غور و خوض شروع ہوا کہ سارتر صاحب کو کہاں ٹھہرایا جائے۔ لاہور کا کوئی ہوٹل ان کے شایانِ شان نہیں ہے۔

اَب ذرا کرشمۂ قدرت دیکھو کہ مجلسِ عاملہ میں منیر نیازی بھی تھے۔ منیر نیازی صاحب کو جب سارتر صاحب کے قیام و طعام کا مسئلہ طے ہوتا نظر نہ آیا تو اس مست مولا شاعر نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں۔ کہا کہ میں نے اچھرہ موڑ پر ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا ہے۔ آپ اسے وہاں ٹھہرا دیں وہ بھی ادیب ہے میں بھی ادیب ہوں۔ ہم گزر کر لیں گے۔

مجلس عاملہ کے سارے ادیب اس پر کچھ سٹ پٹا گئے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ شاعر کی اس بے تکلفانہ اور فراخدلانہ پیش کش سے کیونکر نبٹا جائے۔ آخر اعجاز حسین بٹالوی نے ایک لفظ کہا — کہ نیازی صاحب بات یہ ہے کہ یہ جو یورپ کے لوگ ہوتے ہیں یہ قیام کے معاملہ میں باتھ روم کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ باتھ روم کے معاملہ میں دیسی کام ان کے ساتھ بالکل نہیں ہو سکتا۔

منیر نیازی نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا کہ باتھ روم کوئی مسئلہ

نہیں ہے۔ چارپائی کا مسئلہ ہے ایک چارپائی تو کمرے میں پڑی ہوئی ہے ایک چارپائی اور کہیں سے لے لیں گے اور سارتر بستر تو ساتھ ہی لاتے گا۔

اِس جلسہ کی کارروائی یہاں تک۔ تو ہمیں اس مجلسِ عاملہ کے ایک رکن ادیب کی وساطت سے معلوم ہے۔ آگے کیا طے ہُوا یہ اس نے بتایا۔ بہرحال سارتر صاحب آئے ہی نہیں۔ یوں رائٹرز گلڈ اور منیر نیازی دونوں زحمت سے بچ گئے۔

(۱/۵/۶۹)

پرمیلا دیوی کی مُسکراہٹ سے علی پُور کے ایلی تک

رام چندر جی نے اپنی کھڑاویں بھیجی ہیں۔ یہ اعلان کرتے کرتے بانو قدسیہ صاحبہ نے جیب سے ایک رقعہ نکالا۔ اور ہم نے حیران ہو کر سوچا کہ بیسویں صدی کے آتے آتے راجہ رام چندر جی کی کھڑاویں کاغذ بن کر رہ گئی ہیں۔ یہ قدرت اللہ شہاب کا رقعہ تھا۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے شری رام چندر جی کی کھڑاویں۔ اور تقریب تھی ممتاز مفتی کے ناول 'علی پور کا ایلی' کی۔ مگر بانو قدسیہ صاحبہ نے ایسا سماں باندھا کہ ہم نے جانا کہ ہم اجودھیا میں ہیں اور بانو قدسیہ اپنے رنگ کی راجہ بھرت ہیں۔ انھوں نے خطبۂ صدارت پڑھتے پڑھتے قدرت اللہ شہاب صاحب کو یاد کیا۔ اندوہ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا کہ اس تقریب کی صدارت تو شہاب صاحب کو کرنی تھی مگر ہمارے راجہ رام چندر جی بن باس میں ہیں۔ انھوں نے اپنی کھڑاویں البتہ بھجوا دی ہیں۔

راجہ رام چندر اس سمے لندن کے بنوں میں مارے مارے پھر رہے تھے۔

ادھر راج سنگھاسن پر بانو قدسیہ بیٹھی تھیں۔ رام لیلا کا آغاز محمد طفیل کے مقالے سے ہوا۔ اور محمد طفیل اپنے طور پر ایک اوتار ہیں۔ مقالہ کیا پڑھتے ہیں، شاستر سناتے ہیں۔

جب احمد بشیر نے مفتی صاحب کے بارے اپنا سکیچ پیش کیا تو ہم نے بہت ہاتھ ملے۔ ساری رامائن کو پہلے ہی بانو قدسیہ اپنا چکی تھیں۔ ورنہ ہمارا جی چاہ رہا تھا کہ ممتاز مفتی اور احمد بشیر کے اس ملاپ کو بھرت ملاپ کہیں۔ احمد بشیر تو اب خیر نری سوشلزم لکھتے ہیں۔ لیکن ایک زمانے میں کیا خوب لکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ممتاز مفتی نے ابھی شہاب صاحب کی ذات میں ایک دلی اور اشفاق احمد کی ذات میں ایک ناشر دریافت نہیں کیا تھا۔ توجہ کا مرکز احمد بشیر تھے۔ اس واقعہ کو تو اب بن باس کی مدت سے بھی زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ اس عرصے میں احمد بشیر نے کون کون سے بن کی خاک نہیں چھانی۔ اپنا دوست پاکستانی فلمساز کی لنکا بھی دیکھ آیا۔ جہاں ہر فلمساز راون نظر آیا۔ اور احمد بشیر کا تیلا پربت راون گزروں کی دنیا میں مٹی بن گیا۔ اب پھر لاہور کا ایک گوشہ تھا اور ممتاز مفتی اور احمد بشیر پھر اکٹھے تھے۔ مگر پل کے نیچے سے پانی بہت بہہ چکا تھا۔ اِس طرف بھی اور اُس طرف بھی۔ سو جب احمد بشیر نے ۱۹۴۶ء میں لکھا ہوا خاکہ سنایا تو ہم گنگنائے ؎

یاد نہ کر دلِ حزیں بھولی ہوئی کہانیاں

احمد بشیر نے ممتاز مفتی کی سیرت و کردار کو خوب جانچا پرکھا اور خوب

اس شخص کا کچا چٹھا بیان کیا۔

احمد بشیر کے مضمون کو ہم نے غنیمت جانا۔ کیونکہ باقی سب مضمون تو ناشرد ں کے تھے۔ انھوں نے اپنے اپنے ناشرانہ نقطۂ نظر سے باتیں کیں۔ بشیر چودھری صاحب نے اپنے ناشرانہ نقطۂ نظر سے اور اشفاق احمد نے اپنے ناشرانہ نقطۂ نظر سے۔ اشفاق احمد اب ناشر نہیں ہیں مگر ادب کو وہ ہنوز ناشرانہ نقطۂ نظر ہی سے دیکھتے ہیں۔ سو اس ضخیم ناول کے سلسلہ میں ان کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس پر آدم جی پرائز ملنا چاہیئے تھا جو نہیں ملا۔

اَب ہم توقع کرتے رہے کہ کوئی بھلا مانس آدم جی پرائز کے ابتذال کو فراموش کرکے اس ناول کے بارے میں باتیں کرے گا۔ کچھ ناول کے فنی محاسن بیان کرے گا کچھ ناول نگار کے نقطۂ نظر کی گفتگو کرے گا۔ کچھ 'آپا' اور وید عاش اسے 'علی پور کا ایلی' تک کے ادبی سفر کا احوال بیان کرے گا۔ آخر ممتاز مفتی ایسے ہیٹے لکھنے والے تو نہیں ہیں کہ ادھر ادھر کی باتیں کرکے کچھ لطیفے، کچھ چٹکلے بیان کرکے انہیں ٹال دیا جائے۔ ایک پورا سفر انہوں نے مختصر افسانے کی دنیا میں کیا اور وہ مقام حاصل کیا کہ آج اگر ہم نئے ادب کی تحریک کے زمانے کے افسانوی رجحانات کا تعین کرنا چاہیں تو ممتاز مفتی کو فراموش کرکے یہ تعین نہیں کر سکتے۔ یہ سفر طے کرکے انہوں نے ناول پر ہاتھ ڈالا۔ ناول کی ضخامت دیکھ کر اسے دوسرا 'افسانہ آزاد' کہہ دینا تو کوئی بات نہ ہوئی۔

کچھ اس پر کہو کچھ سنو، مگر اس تقریب میں بولنے والے کیا ناول اور کیا افسانہ مفتی صاحب کے دونوں ہی کاموں سے دامن بچاکر نکل گئے۔

'علی پور کے ایلی' کو دوسرا فسانۂ آزاد شاید اشفاق احمد نے کہا تھا مگر خود ناول نگار نے اپنے ناول کو دوسرا 'ایڈیٹ' (IDIOT) بتایا۔ یعنی انھوں نے پنڈت رتن ناتھ سرشار کو رستے میں چھوڑا اور دوستوئیفسکی سے اپنا دوستانہ جتایا۔ اتفاق کی بات دیکھو کہ ضخامت کے دوستوئیفسکی صاحب بھی بہت قائل ہیں۔ اب دوستوئیفسکی اور سرشار کے درمیان ضخامت کے سوا کوئی نقطۂ اشتراک ہو یا نہ ہو مگر دوستوئیفسکی اور ممتاز مفتی کے درمیان تو ضخامت کے سوا کوئی نقطۂ اشتراک ہونا ہی چاہیئے۔ عقلمندوں کو اشارہ کافی ہوتا ہے مفتی صاحب نے کچھ اشارے کئے تو تھے۔ مگر ہمیں تو ان کا ایک اور ہی اشارہ لے اُڑا اشارہ یہ تھا کہ بمبئی کی دنیائے فلم کی پرمیلا دیوی 'آئیڈیا' کی تلاش میں لاہور آئیں۔ ادھر مفتی صاحب 'آئیڈیاز' سے جیبیں بھرے بیٹھے تھے۔ پرمیلا دیوی نے مسکرا کر کہا کہ بمبئی آؤ۔ مفتی صاحب اس دعوت پر پھولے نہ سمائے۔ اپنی مضامین جمع کر کے 'غبارے' چھپوائی۔ رائلٹی وصول کی اور اڑ کر بمبئی پہنچے۔

پرمیلا دیوی سے قدرت اللہ شہاب تک کا سفر ایک لمبا اور پیچ در پیچ سفر ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مفتی صاحب عشق کی مجازی منزلیں طے کر کے عشقِ حقیقی کی منزل تک پہنچے ہیں۔

(۲۱ مئی ۶۹)

کالی داس گوجرانوالوی

سوال یہ ہے کہ کیا کالی داس گوجرانوالہ میں پیدا ہوا تھا۔ احمد بشیر بے چارے منہ سے بات نکال کر مشکل میں پڑ گئے۔ اور اب تحقیق کرتے پھر رہے ہیں۔ انور سجاد کو اس کا یقین ہی نہیں آتا۔ احمد بشیر نے ہمیں یہ کہہ کر قائل کیا کہ تم روایت کے قائل ہو اور میں نے ڈرامے کی روایت گوجرانوالہ میں ڈھونڈ نکالی ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ اس کی تائید کرو۔ ہم اس تحقیق کی تائید کرتے جاتے ہیں اور سوچتے جاتے ہیں کہ شہروں کی تاریخ بھی عجب طریقہ سے چلتی ہے جس شہر نے کالی داس پیدا کیا تھا اسی شہر کی خاک سے آگے چل کر ڈاکٹر وحید قریشی اُٹھے۔

اصل میں ان دنوں بار بار ایسی صورت پیدا ہو رہی ہے کہ بات حضرت ڈرامے تک جا پہنچتی ہے۔ بانو قدسیہ کی کتاب کی تقریب میں انور سجاد نے شکنتلا اور گوجرانوالہ کے رشتے کو شک کی نظر سے دیکھا تھا۔ ہم نے سوچا کہ چلو رات گئی بات گئی۔ مگر آرٹ کونسل میں رفیع پیرزادہ صاحب نے بات کو پھر کالی داس کے

زمانے تک پہنچا دیا۔ اور وہاں بیٹھے بیٹھے احمد بشیر نے پھر سوال کرنے شروع کر دیئے کہ کونسا ڈرامہ نگار کہاں پیدا ہوا تھا۔ بے چارے پیر صاحب بہت پریشان ہوئے اور بولے کہ صاحبزادے میرا امتحان بہت زیادہ مت لو۔ میں فیل ہو جاؤں گا۔

رفیع پیر صاحب پاکستانی ڈرامے کی دنیا کے پیروں میں سے ہیں۔ ڈرامے اور تھیٹر کی نئی روایت سے شناسائی حاصل کرنے کے لئے وہ جرمنی تک پہنچے تھے۔ مگر اب پیر صاحب کا عالم پیری ہے۔ نہ وہ سج دھج رہی نہ وہ آواز کا طنطنہ رہا۔ اب ان کے پاس ایک عمر کا تجربہ ہے اور بس اور اس تجربے سے استفادے کی صلاحیت آپ میں ہونی چاہیئے ورنہ پیر صاحب کا انداز بیان یہ ہے کہ ابھی یہاں ابھی وہاں۔ ابھی آرٹ کونسل کی بات ہو رہی ہے اور چشم زدن میں کالی داس کے عہد میں پہنچ گئے۔ اس فضا سے جی گھبرایا تو ملکہ الزبتھ کے زمانے میں نکل گئے۔ ملکہ الزبتھ سے بیزار ہوئے تو نوٹنکیوں والے ہندوستان کی طرف جا نکلے۔ انہوں نے آرٹ کونسل میں تین لیکچر دیئے اور تینوں اسی شان سے دیئے۔ چننے والوں نے ان کی انھیں بکھری بکھری باتوں میں سے موتی چن لئے۔

پیر صاحب نے بہت سے سوالوں سے قطع نظر ایک سوال پر بحث کی، کہ ہندوستان میں کالی داس جیسے ڈرامہ نگاروں کے باوصف ڈرامے کی روایت ختم کیوں ہو گئی۔ بعض لوگوں نے اس کی توجیہہ یہ کر رکھی ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی تعصب نے اس سرزمین پر ڈرامے کو ختم کیا۔ پیر صاحب نے اس

سوال کے جواب میں یہ سوال ڈالا کہ مسلمانوں کا مذہبی تعصب تو موسیقی اور رقص کے خلاف بھی تھا۔ پھر یہ فنون کیوں برقرار رہے اور موسیقی میں خود مسلمانوں نے کیوں بڑھ چڑھ کر اپنا تخلیقی اظہار کیا۔ اور اس حد تک گئے کہ ہندومت کے مذہبی ادب کو فارسی میں ترجمہ کر ڈالا۔ مثلاً رامائن کو۔ اگر وہ لوگ رامائن کو فارسی میں ترجمہ کر سکتے تھے اور موسیقی کی ہندوستانی روایت کو اپنا سکتے تھے تو ڈرامے کی ہندوستانی روایت کو اپنانے اور فروغ دینے میں انہیں کیا عار ہو سکتا تھا۔

پیر صاحب کے استدلال کے مطابق ڈرامے کی اس شاندار روایت کے زوال کا سبب خود ہندو تھے۔ سنسکرت زبان اور ویدوں کے متعلق جو ان کا رویہ تھا وہ زوال کا سبب تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ سنسکرت زبان پوتر زبان ہے۔ عام لوگوں تک وہ پہنچی تو اس کی پوترتا برقرار نہیں رہ سکتی۔ اس طرح سنسکرت ڈرامہ ایک مخصوص برگزیدہ طبقہ کے اندر گھٹ کر رہ گیا۔ نہ عام لوگوں تک پہنچ سکا نہ مسلمان تو واردوں تک۔ اس لئے اسے دربار کی سرپرستی حاصل نہ ہو سکی۔ جو موسیقی کو حاصل ہو گئی تھی۔ اس طرح ڈرامے کی روایت رفتہ رفتہ ختم ہو گئی اور ڈرامے کا شوق جو اس سرزمین پر صدیوں سے چلا آرہا تھا، لوک صورتوں میں منتقل ہو گیا۔

پاکستان میں ڈرامے کی روایت کیا صورت اختیار کرے گی۔ اس کے بارے میں پیر صاحب نے گول سی بات کہی کہ نئے لکھنے والے روایت

بنائیں گے۔

مگر نئے لکھنے والے یہ روایت کیسے بنائیں گے۔ لاہور کا سٹیج تو تھی مغز کومیڈی کے سوا کسی ڈرامے کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہی نظر نہیں آتا۔ پیر صاحب نے نئی روایت کی تشکیل کی ذمہ داری آرٹ کونسل پر ڈالنی چاہی مگر جیسا کہ اس محفل میں وضاحت کی گئی آرٹ کونسل یہ دیکھنے پر مجبور ہے کہ ڈرامہ کاروباری اعتبار سے چلتا ہے یا نہیں چلتا۔ پیر صاحب کہتے تھے کہ نفع نقصان آرٹ کونسل کا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے اس لئے کہ آرٹ کونسل کوئی کاروباری ادارہ نہیں ہے اسے ڈرامے کے بارے میں اپنی پالیسی طے کرنی چاہیے۔ اسے یہ طے کرنا چاہیے کہ وہ کس قسم کا ڈرامہ ہے جسے اسے اہمیت دینی ہے۔ یہ طے کر لینے کے بعد اسے اس ڈرامے کے فروغ کی کوشش کرنی چاہیے۔ قطع نظر اس سے کہ اس میں اسے فائدہ ہوتا ہے یا نقصان ہوتا ہے۔

پیرو صاحب کے پاس آرٹ کے متعلق کہنے کے لئے باتیں بہت تھیں مگر وقت اتنا نہیں تھا۔ وہی حساب نکلا کہ آرٹ کا کاروبار بہت لمبا ہے اور عمر مختصر ہے۔ تو یوں لیکچروں کا یہ سلسلہ ایک شدید احساسِ تشنگی چھوڑ کر ختم ہو گیا۔

(۱۵ جون)

موسیقی میں بھی نئی پود پیدا ہو گئی

لیجئے صاحب ایک نئی پود موسیقی کی دنیا میں بھی پیدا ہو گئی۔ مگر اس کی پیدائش نرالے انداز سے ہوئی۔ پرانی نسل خود نئی پود کو گود میں لے کر پاکستان کونسل پہنچی۔ اطلاع دی کہ ہمارے گھرانے میں موسیقاروں کی نئی پود پیدا ہو گئی ہے اور اللہ آمین سے ہم نے اسے پالا ہے۔ سو اب اس کا عقیقہ ہو جانا چاہیئے۔

یہ نئی پود پٹیالہ والوں کے گھرانے میں پیدا ہوئی ہے۔ جو اسے لے کر آتے ان میں اس گھرانے کے بزرگ خاں صاحب اختر حسین خاں تھے۔ ان کے نامی گرامی بیٹے امانت علی فتح علی تھے۔ پیدا ہونے والوں میں امانت علی فتح علی کے چھوٹے بھائی امجد علی حامد علی تھے۔ اور امانت علی کے فرزند ارجمند احمد علی تھے۔ ان کی عمریں ابھی زیادہ نہیں ہیں۔ کسی کو برس چودہواں ہے تو کسی کا سولہ کا سن ہے اور کسی کو ابھی پندرہواں برس لگا ہے۔

پاکستان کونسل نے اس ولادتِ باسعادت کی خوشی میں ایک تقریب

کا اہتمام کیا۔

ہمارے لئے نئی پود کی اس انداز سے پیدائش ایک اعجوبہ تھی۔ ادب کی دنیا میں نئی پود ایک اعلانِ بغاوت کے ساتھ پیدا ہوا کرتی ہے۔ جو پود بزرگوں سے بغاوت نہ کرے اور ان کے بتوں کو منہدم کرنے کا اعلان نہ کرے۔ وہ نئی پود کہلانے کا حق نہیں رکھتی۔ فرمانبرداری اور سعادت مندی ادبی روایت کا دستور نہیں معاشرتی زندگی کا دستور ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب وہ معاشرتی زندگی کا بھی دستور نہیں رہی۔ ادب میں تو یہ دستور ہے کہ اگر نئی پود اعلانِ بغاوت کرتے کرتے کہیں بزرگوں کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرلے تو وہ اسی آن نئی پود کہلانے کے حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہ واقعہ ابھی پچھلے دنوں ہماری ادبی دنیا میں گزر چکا ہے۔ افتخار جالب باغی کے طور پر اچھے خاصے چل رہے تھے کہ اتنے میں اس شہر میں نئی شاعری کے ایک بزرگ ن۔م راشد، وارد ہوئے۔ اس باغی نوجوان نے سعادت مندی کا ثبوت دیا۔ اور راشد صاحب کے سامنے سر جھکا کر زانوئے ادب تہہ کر کے بیٹھا۔ اس پر نوخیز ادیبوں میں ایک شور پڑ گیا اور انہوں نے افتخار جالب کو نئی شاعری کا نوابزادہ نصراللہ خاں کہنا شروع کر دیا۔ افتخار جالب نے اس کے بعد اپنی لغزش کو محسوس کیا، اور سجدہ سہو کے طور پر پھر سے راشد صاحب کے خلاف اعلانِ بغاوت کیا۔ مگر پھر کیا ہوتا تھا۔ اکھاڑے میں پہلوان کا اور ادب میں باغی کا گر کر اٹھنا مشکل ہی ہوتا ہے۔

مگر موسیقی کی دنیا میں ہم نے نئی پود کو اس انداز سے بالکل مختلف انداز میں پیدا ہوتے دیکھا۔ اور حمید شیخ صاحب کی تقریر سے پتہ چلا کہ موسیقی کی دنیا میں تو نئی پود پیدا ہی اس طور سے ہوتی ہے۔ ادب میں گھرانے نہیں ہوتے مگر موسیقی میں گھرانے ہوتے ہیں۔ اور حمید شیخ صاحب کہتے تھے کہ یہ ہماری موسیقی کی روایت پر موقوف نہیں یورپ میں بھی موسیقی کی روایت یہی ہے۔ موزارٹ خاندان ساڑھے تین سو سال پرانا ہے۔ اسی طرح سے موسیقاروں کے اور خاندان ہیں اب اگر کوئی موسیقار گھرانوں اور خاندانوں سے الگ پیدا ہو جائے اور نام پیدا کر لے تو اسے مستثنیات میں شمار کیجئے۔ پٹیالہ کا گھرانا بھی کچھ کم پرانا گھرانہ نہیں ہے ایک وقت میں اس گھرانے کے کرنیل صاحب جرنیل صاحب ہندوستان بھر میں مشہور تھے۔ یہ پرانی بات ہوئی ہمارے لئے تو امانت علی خاں فتح علی خاں ہی کرنیل خاں جرنیل خاں ہیں۔

حمید شیخ صاحب نے پٹیالہ والوں کو دوسرے گھرانوں سے یوں تمیز کیا کہ اس گھرانے کی گائیکی میں ایک مردانگی اور قوت کا احساس ہوتا ہے۔ مگر اس نے نغمہ کی مٹھاس کو زائل نہیں کیا ہے۔ قوت اور شیرینی مل جل کر یہاں اس چاشنی کو جنم دیتی ہیں جسے مخصوص طور پر پنجاب کی چاشنی کہا جا سکتا ہے۔

یوں ہم اپنی آسانی کے لئے ادب میں بھی گھرانوں کی تخصیص کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ مختار صدیقی میراجی گھرانے کے شاعر ہیں۔ مصطفےٰ زیدی کی

گائیکی جوش گھرانے کی گائیکی ہے اور فیض اور قاسمی ترقی پسند گھرانے کے کرنیل خاں جرنیل خاں ہیں۔ مگر نئے ادیب چونکہ بالعموم بی اے۔ ایم اے ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنے گھرانوں کو گھرانے نہیں کہتے بلکہ مغربی تنقید کی اصطلاحوں سے استفادہ کرتے ہوئے مکاتیب فکر کہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ مگر ناک یوں پکڑ دیا ووں پکڑو، بات تو ایک ہی ہے۔

مگر خانصاحب اختر حسین خاں نے کیا خوب فرمایا کہ بی۔ اے بیوقوف ایم۔ اسے ڈبل بے وقوف۔ بی اے۔ ایم اے کا فن سے کیا تعلق"۔ خانصاحب نے بجا فرمایا۔ خالی بی۔ اے۔ ایم۔ اے ادب میں دانشور بن کے رہ جاتا ہے۔ اور موسیقی میں اسلامی روایت اور موسیقی کے رشتے پر بحثیں کرتا رہ جاتا ہے اور ادھر خانصاحب اختر حسین خاں فنکاروں کی ایک اور پود تیار کر ڈالتے ہیں۔

نئی پود نے پہلے ملتانی میں بہادر شاہ ظفر کا خیال پیش کیا۔ جس کے بول تھے

" انہیں ورجن لو گو اسے کیا کہو۔ پھر مارو اکا راگ چھیڑا۔ بول تھے سے مورا پیاین جیارا انکسو جائے ۔" تو خیر فنکاروں نے سامعین سے بہت داد حاصل کی اور پھر بڑی سعادت مندی سے اپنے بزرگوں کے لئے جگہ خالی کر دی۔ سو پھر امانت علی خاں فتح علی خاں آئے انہوں نے راگ باگیشری سنایا۔ یہاں کسی نے خانصاحب اختر حسین خاں سے پوچھا کہ استاد آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے کہ ہمیں اب راگوں کے نام بدل دینے چاہئیں اور پاکستانی نام رکھنے چاہئیں۔ استاد نے سوال کرنے والے کو کڑی نظر سے دیکھا اور یہ کہہ کر چپ کر دیا کہ یہ ایسی بات ہے کہ گنگارام ستاارا کا نام اللہ بخش ستاارا رکھ دیا جائے۔

قصہ اکّے میں بیٹھنے کا اور مشاعرے لوٹنے کا

وارد ہونا شاعر کا لکھنؤ میں، سوار ہونا اکّے پر اور جانا کباب کھانے کے لئے چوک میں۔ تذکرہ ابو الاثر حفیظ جالندھری کا۔ اور بیان عشرت رحمانی کا۔ مگر عشرت رحمانی سب کچھ نادانستہ کہہ رہے تھے۔ انھیں یہ مطلق پتہ نہیں تھا کہ اس سے پہلے شاعر کا ایک مدّاح یہ ثابت کرچکا ہے کہ حفیظ صاحب تو موٹر کار کے شاعر ہیں۔ اکّہ سیماب اکبر آبادی کے مقدر میں لکھا گیا تھا۔ کچھ پھولوں کے گجرے ضرور ان کے گلے میں پڑنے تھے۔ مگر وہ بھی بالآخر حفیظ صاحب ہی کے گلے کی زینت بنے۔ یہ واردات علی گڑھ میں ایک مشاعرے کی تقریب سے گزری۔ مدّاح نے بڑی تفصیل سے اور خوب مزے لے لے کر بیان کیا کہ سیماب اکبر آبادی تھرڈ میں سفر کرکے علی گڑھ پہنچے جبکہ حفیظ صاحب سکنڈ میں بیٹھ کر آئے تھے۔ اور سیماب اکبر آبادی کے مدّاح ان کے لئے پھولوں کے گجرے لئے کھڑے تھے۔ مگر ہم نے ان سے گجرے مانگے اور حفیظ صاحب کے گلے میں ڈال دیئے۔ اسی پر بس نہیں

ہوا۔ پھر یہ ہوا کہ سیماب صاحب تو اکے میں بیٹھ کر سٹیشن سے روانہ ہوئے اور حفیظ صاحب کے لئے موٹر کار تیار کھڑی تھی۔

یہ داستان ہم نے سُنی اور حیران ہو کر سوچا کہ کمال ہے۔ حفیظ صاحب علی گڑھ گئے، لکھنؤ گئے۔ مشاعرے پڑھے۔ شہر لوٹے مگر اکے میں نہیں بیٹھے۔

ابھی ہم شاعر کی اس حرماں نصیبی پر افسوس کرتے تھے کہ عشرت رحمانی وارد ہوئے اس محفل کا ایک دور تمام ہو کر اب دوسرا دور بھی کئی ایک منزلیں طے کر چکا تھا کہ عشرت رحمانی صاحب کی آمد کا واقعہ جانفزا ظہور میں آیا۔ بات یہ ہے کہ عشرت رحمانی صاحب آج ہی شام خود بھی ایک محفل کے دولہا تھے۔ اور حفیظ صاحب کا براتی بننا بھی ان کے لئے ضرور تھا۔ انہوں نے دونوں کام خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔ پہلے پاکستان کونسل میں اپنی باری بھگتائی ڈرامے کی داستان سنائی اور پھر وہاں سے اٹھ، مقالہ بغل میں داب، قیوم نظر کو کاندھے پہ ڈال سیدھے چودھری حمید صاحب کے گھر پہنچے جہاں آج حفیظ صاحب کی سترھویں سالگرہ منائی جا رہی تھی۔

عشرت رحمانی صاحب ابھی آ کر بیٹھے ہی تھے کہ تقریر کرنے کے لئے کھڑے کر دیئے گئے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ عشرت صاحب تحریر اور تقریر دونوں میں یکساں رواں ہیں۔ پہلے مداح نے پوری جزئیات نگاری کے ساتھ حفیظ صاحب کا سفرِ علی گڑھ بیان کیا تھا۔ دوسرے مداح نے اسی جزئیات نگاری کے ساتھ شاعر کا سفرِ لکھنؤ بیان کیا۔

عشرت صاحب نے لکھنؤ کی باتیں کرتے کرتے ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک روز حفیظ صاحب نے اصرار کیا کہ ہم اکے میں بیٹھیں گے اور چوک جا کر لکھنؤ کے کبابوں کا مزہ چکھیں گے۔ آخر کو اکہ آیا اور حفیظ صاحب شوکت تھانوی مرحوم اور عشرت صاحب کے ہمراہ اکے میں بیٹھے۔ ہم نے یہ سنا اور اطمینان کا سانس لیا کہ لاہور کی فضا میں سانس لینے والے شاعر نے لاہور سے دور کی سواریوں کی بھی لذت لوٹی ہے۔ اصل میں مداح اپنے حساب سے شاعر کی تعریف کرتے ہیں اور شاعر اپنے حساب سے چلتا ہے۔ شاعر کو مداحوں نے علی گڑھ میں اکے میں بیٹھنے نہ دیا ہو مگر لکھنؤ آ کر اس نے اپنا حق خود اختیاری استعمال کیا اور اکے میں بیٹھا۔

اکہ تو اصل میں علی گڑھ ہی کا ہوتا ہے مگر خیر لکھنؤ کا اکہ بھی ایسا برا نہیں ہوتا۔ آخر پنڈت رتن ناتھ لکھنؤ کے اکوں میں بیٹھ بیٹھ کر سرشار بنے تھے۔ حفیظ صاحب بھی لکھنؤ کے اکے میں بیٹھے۔ مگر لکھنؤ کا اکہ علی گڑھ کے اکے سے بڑھ کر نکلا۔ چار قدم چلتا تھا اور رک جاتا تھا۔ حفیظ صاحب نے اکے والے سے جلدی چلنے کا تقاضا کیا تو نستعلیق اکے بان نے شاعر کو دیکھا اور بعد شائستگی عرض کیا کہ میرا گھوڑا نوابزادہ ہے اپنی مرضی سے چلتا ہے۔ آگے آپ کی مرضی ہے۔

شاعر نے تن بہ تقدیر اپنے آپ کو نوابزادے کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ نشتم پشتم کبابی کی دوکان پر پہنچا، قطار میں کھڑا ہوا اپنی باری پر کباب لئے اور

مزے سے ملے لے کر کھائے۔

مشتے نمونہ از خروارے۔ ہم نے تو شاعر کا موٹر سے اکے تک کا سفر جس طرح سنا اس طرح بیان کر دیا ہے۔ باقی بیان کرنے کے لئے بہت کچھ ہے۔ اور اس محفل میں بھی بہت کچھ بیان کیا گیا۔ بقولِ شاعر:

ع یہ نصف صدی کا قصّہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

اس نصف صدی کے قصے میں غزل بھی شامل ہے نظم بھی شامل ہے۔ اور گیت بھی۔ ان تینوں اصناف میں اپنا منفرد مقام حاصل کیا۔ لاہور سے نکل کر دُور دور تک مار کی اور مشاعرے لوٹے۔ ایک زمانے میں وہ ان چند گنے چُنے شاعروں میں تھے جن کا اردو شاعری میں ڈنکا بجتا تھا۔ ان کے نام سے مشاعرے جمتے تھے اور اکھڑتے تھے۔

مگر شاعری کا سفر اپنی جگہ اور عمر کا سفر اپنی جگہ۔ ایک وقت میں حفیظ صاحب کی شاعری نئی شاعری تھی۔ مگر شاعری پھر نئی ہوتی ہی چلی گئی اور اتنی نئی ہوئی کہ حفیظ صاحب پرانے شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ شاعر کو دو محاذوں پر لڑنا پڑا۔ شاعری کے محاذ پر اور عمر کے محاذ پر۔ عمر کے محاذ پر بھی حفیظ صاحب کم نہیں لڑے۔ اپنی گولڈن جوبلی کے بعد بھی وہ یہ ترانہ الاپتے رہے کہ ؎

ابھی تو میں جوان ہوں۔

اب گولڈن جوبلی کو بھی بیس برس گزر چکے ہیں۔ اب عمر کے ستر برس

ہیں اور شاعر ہے۔ بہتر واں برس اس طور سے گزرا کہ شاعر کے لینے کے دینے پڑ گئے۔ سمجھنے والے سمجھے کہ شاعر کا دمِ واپسیں ہے۔ مگر ابھی تو میں جوان ہوں، کا ترانہ الاپنے والے شاعر نے ایک مرتبہ تو موت کو پیچھے دھکیل ہی دیا۔

اب ستّر برس پورے ہو رہے تھے اور شاعر اپنے دوستوں، مدّاحوں اور شاعری کے رسیاؤں کی محفل میں دولھا بنا بیٹھا تھا۔ اگلے پچھلے قِصّے سنائے جا رہے تھے۔ اور شاعر پر تنقیدی محاکمے کئے جا رہے تھے۔ مگر آج کسی نے بھی ابھی تو میں جوان ہوں سنانے کا تقاضا نہیں کیا۔ آج شاعر یہ کہہ رہا تھا ؎

مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

اِس طویل نظم کی صورت میں شاعر نے اپنی گزری ہوئی زندگی پر ایک نظر ڈالی۔ مدّاحوں کو جو یاد تھا وہ انھوں نے بیان کیا۔ پھر کچھ شاعر نے اپنی پسند سے غزلیں اور نظمیں سنائیں۔ کچھ دوستوں اور مدّاحوں کی پسند پر بھروسہ کر کے نظمیں اور غزلیں سنائیں۔

اس بہانے چودھری حمید صاحب نے بھی اپنا بچپن یاد کر لیا۔ جب حفیظ صاحب چودھری صاحب کے ماموں کی دوستی میں ان کے گھر آتے جاتے تھے۔ اور انھیں کاغذ کی ٹوپی پہنا کر خوش ہوتے تھے۔

(۱۶/۱)

اُردو تنقید کا سُرخ مسافر مسکراتا ہوا گزر گیا

تازہ واقعہ یہ ہے کہ اُردو کے ممتاز نقّاد پروفیسر ممتاز حسین لاہور آئے۔ اور لاہور آکر مسکرائے۔

پس منظر اس واقعہ کا یہ ہے کہ اُردو تنقید ثقاہت کی قائل ہے مسکراہٹ کی نہیں۔ پروفیسر سید وقار عظیم البتہ مسکراتے دیکھے گئے ہیں۔ مگر صرف محفل میں۔ مگر پروفیسر ممتاز حسین خالص مارکسی نقاد ہیں اس لئے وہ زندگی بھر کبھی نہیں مسکرائے۔ نہ تنقید میں نہ محفل میں۔ نہ نجی ملاقات میں۔ مگر اس پر آشوب دور میں جب ہر سوشلسٹ نیز ہر اسلام پسند غصے سے لال پیلا ہو رہا ہے ممتاز حسین لاہور آئے اور نوخیز سوشلسٹوں کی ادبی تنقید سن کر مسکرائے۔

ممتاز حسین صاحب نے ٹی ہاؤس میں آکر اپنی مارکسی متانت اور سرخ ثقاہت کو تا دیر برقرار رکھا۔ ادب پر ہر انقلابی محاکمہ کو لینن اور مارکس کا قول نقل کر کے رد کیا۔ رفتہ رفتہ انھوں نے فضا کو سونگھا اور چپ ہو گئے۔ دیر تک چپ رہے۔

اور ادب پر صادر ہونے والے فتوے سنتے رہے۔ پھر اچانک مسکرائے اور آخر کو بے قابو ہو کر اونچی آواز سے ہنسے۔ یہ پروفیسر ممتاز حسین کی ادبی زندگی کا پہلا قہقہہ تھا۔ جو اس وقت بلند ہوا ہے جب ان کے سر کے سارے بال سفید ہو چکے ہیں۔ اب آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ترقی پسند تحریک کا پہلا اور آخری قہقہہ صرف صفدر میر ہیں۔

مسئلہ صرف رجعت پسند اور ترقی پسند کا نہیں ہے بلکہ نئے اور پرانے کا بھی ہے۔ وہ زمانہ گذر گیا جب ہر ترقی پسند ادیب نیا ادیب ہوتا تھا۔ یہ تحریک اپنی ایک عمر گزار چکی ہے۔ اب اس دنیا میں ایک پوری برادری بوڑھوں کی ہے اور ایک ٹولی نوخیزوں کی ہے۔ اردو تنقید کا سرخ مسافر جب مارکسیت کا بہت رنج سفر سہنے کے بعد اور جدلیاتی ہرج مرج کھینچنے کے بعد برسوں ٹی ہاؤس میں آیا تو ان نوخیزوں نے جو یہ سفر ہنوز ٹی ہاؤس کے اندر ہی اندر کر رہے ہیں مسافر کو گھیرا، سوالات کئے اور کہا صاحب آپ کومٹ منٹ کیوں نہیں کرتے۔

کومٹ منٹ کا مطالبہ اور ممتاز حسین سے۔ ہم نوخیز سوشلسٹوں کی معصومیت پر اور ممتاز حسین کی مظلومیت پر جی کھول کر ہنسے۔ مگر ممتاز حسین صاحب بھی شاید آج کچھ طے کر کے ہی طوافِ کوئے ملامت پر آئے تھے۔ ادب پر انقلابی محاکمے کی تردید میں انھوں نے مارکس کا، مارکس کا نہیں تو لینن کا قول نقل کر دیا۔

نوخیز ادیب کہہ رہا تھا کہ مولانا حالی کی شاعری اپنے مخصوص تاریخی پس منظر میں انقلابی تھی مگر آج کے دور میں ہمارے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔

پروفیسر ممتاز حسین نوجوان کو سمجھانے لگے کہ تاریخ ایک تسلسل کا نام ہے۔ ہم کسی پچھلی تحریک کو یہ کہہ کر خارج یا فراموش نہیں کر سکتے کہ وہ اُس تاریخی پس منظر میں معنی رکھتی تھی اور اب معنی نہیں رکھتی۔

تب نوخیز ادیب مولانا حالی سے پیچھے گیا اور اعلان کیا کہ ساری داستانوں اور سارے تصوّف والے ادب کو جلا دینا چاہیئے۔ پروفیسر ممتاز حسین بولے۔ "مگر لینن نے یہ کہا ہے کہ پرانے تہذیبی ورثے کی حفاظت کرنی چاہیئے"۔

نوجوان نے ممتاز حسین کو سمجھانا شروع کیا کہ وہ جو پرانے ادیب تھے وہ سخت رجعت پسند تھے۔ ان کا طرزِ احساس بالکل مذہبی تھا۔ ممتاز حسین پھر لینن کو درمیان میں لے آئے۔ بولے کہ جو لوگ ٹالسٹائے کو مذہب پرست کہہ کر رد کرتے تھے انہیں لینن نے ڈانٹا اور کہا کہ اگر کسانوں میں مذہبی طرزِ احساس موجود تھا تو کیا ٹالسٹائے ان کی زندگی کا مرقع پیش کرتے ہوئے کس طرح فراموش کر دیتا۔

پھر نوجوان نے پرانے ادیبوں کی طبقاتی حیثیت گنانی شروع کر دی کہ وہ کس طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ایک طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ایک طبقہ سے تعلق رکھ کر آدمی کس طرح ذہنی طور پر اسی طبقے کے اندر اسیر ہو جاتا ہے۔ ممتاز حسین نے پوچھا "اور مارکس کس طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اینگلز کس طبقہ سے تعلق رکھتا اور لینن کس طبقہ سے تھا۔

پھر نوجوان نے ادب کو جانچنے اور پسند کرنے کی یہ کسوٹی بنائی کر یہ

دیکھنا چاہیئے کہ کس قسم کا خیال پیش کیا جا رہا ہے۔ ممتاز حسین بولے اور یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اظہار کیسا ہوا ہے۔

"اگر خیال رجعت پسندانہ ہو تو؟"

"اگر خیال رجعت پسندانہ ہو مگر اظہار خوبصورت ہو تو ہم اظہار کی حد تک اس ادب کو پسند کریں گے۔"

ہم نے کہا اگر خیال انقلابی ہو اور اظہار۔۔۔۔۔ ممتاز حسین صاحب بولے کہ مائیکوفسکی انقلابی شاعر تھا اور لینن کے بارے میں اس نے شاندار قصیدہ لکھا تھا۔ مگر لینن نے صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے اس شخص کی شاعری مطلق پسند نہیں۔

مگر ادب کا مقصد؟ نوجوان مقصدیت پر کچھ کہنے لگا تھا کہ ممتاز حسین نے پھر لینن کو آگے کر دیا۔ "لینن نے یہ کہا تھا کہ ادب اپنا مقصد آپ ہے۔"

"جی؟" اب ہمارے چونکنے کی باری تھی۔ اگر لینن نے یہ کہا تھا تو ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے سارے لڑائی جھگڑے کیا تھے۔ ممتاز حسین صاحب کہتے تھے کہ اصل میں ترقی پسند تحریک کے وقت جوش میں بہت سی باتیں کہی گئی تھیں۔ اب نئے سرے سے ادب کی مارکسی تعبیر مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک پرجوش ترقی پسند نے شاعری میں استعارے کے مقام ہی سے انکار کر دیا۔ تب میں نے اپنا مقالہ "رسالہ درمعرفت استعارہ" لکھا اور اب میں نئے سرے سے ادب کی مارکسی تعبیر مرتب کر رہا ہوں۔

ہم نے یہ باتیں بر قائمی ہوش و حواس سُنیں اور ایک سوشلسٹ دوست سے دُہرائیں۔ وہ ہنسا اور بولا کہ ترمیم پسندی (REVISIONISM) اور کسے کہتے ہیں۔

صاحب بات یہ ہے کہ ہر نیا نظام فکر شروع میں پرجوش طہارت پسند ہوتا ہے۔ مگر طہارت پسندی کی گاڑی زیادہ دور تک نہیں چلا کرتی۔ انسانی زندگی اتنی رنگارنگ ہے کہ کوئی نظام افکار اس کی زد میں آنے کے بعد خالص نہیں رہتا آخر آدمی کتنی دیر تک کسا بندھا رہ سکتا ہے اور کب تک اپنے چہرے پہ تناؤ قائم رکھ سکتا ہے۔ پروفیسر ممتاز حسین جیسے ثقہ مارکسی کو بھی بالآخر ہنسنا پڑا۔ اور آدمی ہنسا سو پھنسا۔ بس یہیں سے ترمیم پسندی کی داغ بیل پڑ جاتی ہے۔

ایک بات اور ہے عمارت نئی نئی ہو تو بس وہ اینٹ گارے کا کھیل ہوتی ہے مگر جب اس کی دیواروں پہ رفتہ رفتہ کاہی جم جاتی ہے اور چڑیاں منڈیروں پہ بہت بیٹھیں کرچکتی ہیں اور کنگرے آندھی بارش کے تھپیڑے کھا کھا کر تھوڑے بوسیدہ ہو جاتے ہیں تب وہ عمارت تہذیب بنتی ہے۔ لگتا ہے کہ روس میں مارکسیت کی عمارت پر کاہی جمنی شروع ہوگئی ہے اور چڑیوں نے منڈیروں پہ بیٹھیں کرنی شروع کردی ہیں۔ خیر ہم اس گھریلو جھگڑے میں کسی کے طرفدار نہیں مگر انصاف کی کہیں گے کہ اگر روس کے ادیبوں کے چہروں کا تناؤ واقعی کم ہوگیا ہے اور واقعی وہ اب پروفیسر ممتاز حسین کی طرح مسکرانے بھی لگے ہیں تو پھر ترمیم پسند بن کر انھوں نے کچھ کھویا نہیں کچھ گنوایا ہے تو واپس لیا ہے۔

ادب کی تاریخ میں چھانٹی

یادش بخیر ڈاکٹر وحید قریشی کل پرسوں میں ہم نے ان کا ایک انٹرویو پڑھا ہے۔ اس وقت سے بہت بیکلی ہے۔ جی چاہتا ہے ان کا مصرعہ اٹھایا جائے۔

ڈاکٹر وحید قریشی آدمی تو صاف گو ہیں۔ لگی لپٹی انہوں نے رکھی ہی نہیں۔ قطعی لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ "قیام پاکستان سے قبل کا ادب طالب علموں کو نہیں پڑھنا چاہیئے۔" ولی دکھنی سے لے کر علامہ اقبال تک اردو کے سب شاعروں اور نثر نگاروں کا تو اسی ایک فقرے میں کام ہو گیا۔ پھر بھی ڈاکٹر صاحب نے از راہِ احتیاط ادر گرد ایک نظر ڈال لی کہ شاید کوئی ادیب ان کے وار سے بچ کر نکل گیا ہو۔ اور واقعی ان کی اس ضرب کاری کے بعد بھی چند ادیب جہاں تہاں پڑے سسک رہے تھے۔ بات یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بھی تو بعض ادیب ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق کے باوجود زندہ رہے اور لکھتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بقیۃ السیف کو بہت خوبصورتی سے ٹھکانے لگایا ہے۔ ان کا بیان ملاحظہ فرمایئے:۔

"پاکستان کے لئے صرف وہی ادیب و ادب مفید ہو سکتا ہے جو اس علاقہ میں پیدا ہو یا ان لوگوں نے ادب پیدا کیا جنھوں نے پاکستان کے وجود کو جذباتی، عقلی و فکری طور پر قبول کر لیا ہے۔ لیکن وہ ادیب جن کی جڑیں قیام پاکستان کے بعد بھی ہندوستان میں ہیں ان کی تحریریں ہمارے لئے بھی مفید نہیں ہو سکتیں۔ پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور غلام عباس وغیرہ کی تحریریں تدریسی نصابات میں کیوں شامل کی جائیں کیا یہ ادیب پاکستانی ہیں یا پاکستانی فکر کی تائید و حمایت کرتے ہیں۔ یا پاکستانی تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔"

اس بیان میں اظہار کی جو خامیاں ہیں وہ تو خیر انٹرویو قلم بند کرنے والے کی بھی ہو سکتی ہیں مگر جو منطقی گھپلے ہیں وہ تو ڈاکٹر صاحب ہی کے ذہنِ رسا کے شگوفے ہیں۔ مثلاً اگر پاکستان کے لئے وہی ادیب اور ادب مفید ہو سکتا ہے جو اس علاقے میں پیدا ہوا تو بے چارے کرشن چندر کو آپ کیوں دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینکے دے رہے ہیں اور اگر شامل نصاب ہونے کے لئے ادیب کا اس علاقہ سے تعلق کے ساتھ ساتھ پاکستانی ہونا بھی شرط ہے تو پھر غریب غلام عباس کو کس جُرم کی پاداش میں نصاب کے لئے ممنوع قرار دیا گیا۔

غلام عباس تقسیم سے پہلے بسلسلہ ملازمت لاہور سے دلی چلے گئے تھے۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو انہوں نے واپس آ جانے میں مطلق تاخیر نہیں کی۔ پھر ان چوبیس برسوں میں انہوں نے افسانے بھی اچھی خاصی تعداد میں لکھے۔ مگر کیا غلام عباس کا یہ جرم کم ہے کہ انہوں نے اپنا نامی گرامی افسانہ "آنندی" متحدہ ہندوستان ہی کے زمانے میں لکھ ڈالا۔ کیا وہ اس افسانے کو پاکستان کے قیام تک کے لئے ملتوی نہیں کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اچھا کیا کہ اس بے صبرے افسانہ نگار کو نصاب کے لئے ممنوع قرار دے دیا۔

غلام عباس کے بعد جو 'وغیرہ' آیا ہے اسے بھی آپ معمولی وغیرہ وغیرہ نہ سمجھیں اس 'وغیرہ' کے ذیل میں غلام عباس کے وہ سارے ہمعصر آگئے جنھوں نے پاکستان کے قیام کا مطلق انتظار نہیں کیا۔ لکھتے چلے گئے اور کتابیں چھپواتے چلے گئے۔

منشی پریم چند کے بارے میں بھی ڈاکٹر وحید قریشی کی تجویز خوب بلکہ بہت خوب ہے۔ ہم نے اورنٹیل کالج کے زعمائے ادب کی خدمت میں جانے کتنی بار گزارش کی تھی کہ بزرگو! اردو افسانے کی تاریخ منشی پریم چند کے بعد بھی چلی ہے۔ مگر انھوں نے نصاب بناتے وقت اس واقعہ کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اب یکایک ڈاکٹر وحید قریشی نے جھرجھری لی ہے۔ مگر ؏ تلافی بھی جو کی ظالم نے کیا کی۔

کہتے ہیں کہ پریم چند کو نصاب میں شامل ہی نہیں ہونا چاہیے۔ چلئے پریم چند کو ڈاکٹر صاحب نے نصاب سے خارج کر دیا۔ مگر ڈاکٹر صاحب کو پتہ ہے کہ ان کے شاگرد کتنے نافرمانبردار ہیں اگر انھوں نے نصاب کی مقدس حدود سے تجاوز کر کے پریم چند کے افسانے پڑھ لئے تو پھر کیا ہوگا۔ کیا ایسا انتظام نہیں ہو سکتا کہ پریم چند کے نام ہی کا انھیں پتہ نہ چلنے پائے۔

آخر نصاب میں اردو افسانے کی تاریخ تو شامل ہوگی۔ یہ ثابت کر دینا ڈاکٹر صاحب کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے کہ اردو کا پہلا افسانہ پریم چند نے نہیں بلکہ فلاں فلاں شخص نے لکھا تھا مگر اس سے وہ کیسے انکار کریں گے کہ اردو مختصر افسانے کی باقاعدہ روایت پریم چند ہی سے شروع ہوتی ہے۔ بس یہی فتنہ کی جڑ ہے۔ شاگرد پوچھے گا کہ پریم چند کون تھے۔ اسی کون اُدُ کیا میں شاگرد انگلی پکڑتے پکڑتے پہنچا پکڑ سکتا ہے۔

بعد پریم چند سے بھی کچھ بڑے بڑے بیٹھے ہیں۔ مثلاً ایک ہندو پنڈت رتن ناتھ نام کا گزرا ہے جس کے 'فسانۂ آزاد' کو اردو فکشن کا کوئی طالب علم نظر انداز کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ شاعری کا دامن بھی ایسا پاک نہیں۔ آخر مثنوی گلزار نسیم کے تذکرے کو مثنویوں کے تذکرے سے کیسے خارج کیا جائے گا۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اردو ادب کی تاریخ کا ایک EXPURGATED اڈیشن تیار کیا جائے۔ جہاں جہاں رتن ناتھ سرشار، پریم چند اور دوسرے ایسے ناپسندیدہ نام آئیں وہاں نقطے ڈال دیئے جائیں۔

اصل میں یہ سارے سوالات اس لئے پیدا ہوئے کہ ڈاکٹر صاحب ایک قطعی بات کہہ کر اگر مگر کے جھمیلے میں پھنس گئے۔ انہوں نے ایک سیدھی سی بات کہہ دی تھی کہ: "قیام پاکستان سے قبل کا ادب طالب علموں کو نہیں پڑھنا چاہیے۔" کیوں نہیں پڑھنا چاہیے اس لئے کہ "اس وقت کا ادب کانگرس، ہندوؤں کی تہذیب و نقطۂ نظر کی عکاسی کرتا ہے۔"

اس جامع بیان میں حالی سے لے کر غالب تک اور غالب کے بعد سرسید، حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، علامہ اقبالؒ سب لپیٹ گئے۔ باقی تو انہیں ادیبوں کا مسئلہ رہ جاتا تھا جو اس وقت پاکستان میں سانس لے رہے ہیں۔ تو انہیں بھی موصوف نے بڑی پرکاری سے سنگھوا لیا ہے۔

آخر میں تو ڈاکٹر وحید قریشی کی اپنی شاعری ہی بچ رہتی ہے۔ اس شاعری کی ٹکر کا افسانہ بھی بآسانی فراہم ہو سکتا ہے اور نیشنل کالج کے نصاب کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے+

ادھیڑ عمر اہلِ دل کی ایک محفل

پاکستان کونسل میں اس بار عجب رنگ کی محفل آراستہ ہوئی۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ قیوم نظر صاحب نے عمرِ رفتہ کو آواز دینے کا اہتمام کیا۔

اس محفل میں ایسے نوجوان بھی تھے جو پاکستان بننے کے آس پاس پیدا ہوئے تھے اور ایسے لوگ بھی تھے جو بہ قائمی ہوش و حواس نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزار چکے ہیں۔ نوجوان حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر پختہ عمر والے ایک لذت کے ساتھ اپنے بیتے زمانے کو یاد کر رہے تھے۔ اور فرمائش پہ فرمائش کر رہے تھے۔ ایک طرف سے آواز آئی ع

کہ وہ شوخ جس گھر میں مہمان ہو گا

دوسری سمت سے کسی نے پکارا کہ استاد رس رس کے اور بیس بس کے والی ہو گی۔ کسی بزرگ نے چٹ بھیجی ع

میرے مولا بلا لو مدینے مجھے

اور ہر بار ماسٹر اعجاز علی معذرت کرتے کہ کیا عرض کروں۔ چالیس برس پہلے کی بات ہے۔ کچھ یاد نہیں اور پھر شروع ہو جاتے ؎

کہ وہ شوخ جس گھر میں مہمان ہوگا
قیامت کا اس گھر میں سامان ہوگا
مری جان مانگی تو کیا تم نے مانگا
مری جان کا کیا مری جان ہوگا

پھر آواز آئی۔ استاد رس رس کے۔ اور استاد شروع ہو گئے۔ ؎

واں تو چھڑکے گئے چٹکی میں نمک پیس پیس کے
یاں تو اچھے نہ ہوئے زخم جگر رس رس کے
خنجر دیکھاں کٹاری اور چھری ان سب نے
خوب زخمی کئے جب بس میں پڑے جس جس کے

پھر ایک فرمائش اور پھر ماسٹر اعجاز علی شروع ہو گئے ؎

اب دوا دیتے ہیں وہ اور نہ دعا دیتے ہیں
اپنے بیمار کو دامن کی ہوا دیتے ہیں
کبھی لکھتے ہیں زمیں پر مرا نام انگلی سے
کبھی جھنجھلا کے وہ پاؤں سے مٹا دیتے ہیں
دے دے اس حسن کی خیرات کہ عرصہ گزرا

ہم فقیرانہ ترے در پہ صدا دیتے ہیں

نوجوان حیران تھے کہ یہ کیا شاعری ہے اور کیا موسیقی ہے. کبھی حیران ہوتے کبھی کھلکھلا کر ہنستے. کسی نے آواز لگائی کہ کوئی نیا گانا سنایئے. اس پر ادھیڑ عمروں نے غصیلی نظروں سے نوجوانوں کو دیکھا اور کہا کہ ہم نے ماسٹر صاحب کو نئے گانوں کے لئے نہیں بلایا. ہم تو پرانے زمانے کو یاد کرنا چاہتے تھے. بالکل ٹھیک ہے قیوم نظر نے اس پروگرام کا عنوان ہی یادش بخیر رکھا تھا.

یادش بخیر آج سے چالیس برس پہلے کچھ آوازیں تھیں کہ فضا میں گونجتی رہتی تھیں. اور دلوں میں ہلچل پیدا کرتی تھیں. ایک آواز تھی. ع

میرے مولا بُلا لو مدینے مجھے

کہ روح میں ارتعاش پیدا کرتی تھی. پھر کچھ اور بول تھے. اور آوازیں تھیں. جو اس وقت کی جذباتی زندگی کی تفسیر کرتی تھیں. ے

اب دوا دیتے ہیں وہ اور نہ دعا دیتے ہیں
اپنے بیمار کو دامن کی ہوا دیتے ہیں

یا ے

کہ وہ شوخ جس گھر میں مہمان ہوگا
قیامت کا اس گھر میں سامان ہوگا

وہ زمانہ پارسی تھیٹر کا تھا. فلم نے ابھی زور نہیں باندھا تھا. بات سٹیج

سے نکلتی تھی اور کوٹھوں پر چڑھتی تھی۔ پھر گراموفون کمپنی جس آواز کو ریکارڈ کر لیتی وہ آواز گھر گھر پہنچتی اور اگر اس میں دلوں میں گھر کرنے کی واقعی صلاحیت ہوتی تو دلوں میں گھر کرتی اور فضا پر چھا جاتی۔

اِن چالیس برسوں میں زمانے نے بہت جلدی جلدی کروٹیں لیں۔ جذباتی زندگی کی شکلیں بدلتی چلی گئیں۔ جو نغمے کبھی دلوں میں لرزش پیدا کرتے تھے وہ بے اثر ہوتے چلے گئے اور رفتہ رفتہ معدوم ہو گئے۔ جو آوازیں گلیوں بازاروں کی فضا میں ریکارڈوں کی صورت چھائی رہتی تھیں وہ پسپا ہوتی چلی گئیں۔ کچھ آوازوں کو موت نے خاموش کر دیا۔ کچھ آوازیں زمانے کی ناقدری کا شکار ہو کر بیٹھ گئیں۔ کچھ آوازیں بڑھاپے کے بوجھ سے ڈھے گئیں۔

ان گم ہو جانے والی آوازوں میں ماسٹر اعجاز علی کی آواز بھی ہے۔ قیوم نظر صاحب نے کسی بھلی گھڑی میں اس گمشدہ آواز کو ٹٹول نکالا۔ پاکستان کونسل میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ ایوب رومانی صاحب نے ابتدائی کلمات کہے۔ ایک ناسٹلجیا کی کیفیت کے ساتھ انھوں نے اپنے امرتسر کے بچپن کے دن یاد کیے۔ جب وہ ریکارڈ سے نکلتی آواز سنتے تھے کہ میں ہوں بھائی چھیلا پٹیالے والا۔ اور میں ہوں ماسٹر اعجاز علی۔ اور ان شخصیتوں کو دیکھنے کی آرزو کرتے تھے۔ پھر ماسٹر اعجاز علی نمودار ہوئے۔ ان کی آواز نے ادھیڑ عمروں کے حافظے کو جگایا۔ خوابیدہ یادوں کو جگایا۔ گمشدہ نغمے دل و دماغ میں پھر سے

گونجنے لگے۔ ان نغموں سے جو دل کے افسانے وابستہ تھے وہ یاد آنے لگے۔
زمانہ شیں ہوئیں اور یاروں نے بھولے بسرے نغمے اس طرح سُنے جیسے آدمی
ایک عمر گزرنے کے بعد اپنی جوانی کے دنوں کو یاد کرتا ہے۔ اس یاد میں وہ
لذت بھی لیتا ہے اور ہنستا بھی ہے کہ ہم بھی کتنے سادہ تھے، کہ یوں خوش
ہوتے تھے اور یوں غمزدہ ہوتے تھے۔

اور اب ماسٹر اعجاز علی کو سُنیئے ؎

مرے مزار کو چھلنی کیا ہے تیروں سے
بہانہ یہ ہے کہ روزن کئے ہوا کے لئے

اس شعر پر ہم نے داد بھی بہت دی اور ہنسے بھی بہت۔ مگر آج سے
چالیس برس پہلے کے صاحبِ دل اس پر ہنستے کب ہوں گے وہ تو دل تھام
کے رہ جاتے ہوں گے۔ زمانے کے ساتھ عاشقوں کے طور بھی تو بدلتے چلے
جاتے ہیں۔ آج جن شعروں پر اہلِ دل اور ستم زدگان گداز ہو جاتے ہیں اور
سر دھنتے ہیں آج سے چالیس سال بعد کے اہلِ دل کے لئے وہ کتنے مضحکہ
خیز بن جائیں گے۔

(۹ مئی)

سسّی عورت یا استعارہ ؟

پٹھاناں خاں ملتان سے آیا اور لاہور کو لوٹ لے گیا۔ تقریب اس ہُنرمند کے ورود کی یہ تھی کہ پاکستان کونسل میں خواجہ فرید کا یوم منانے کا اہتمام کیا گیا۔ خواجہ فرید کی شاعری پر مقالے پڑھے گئے، کافیاں سنائی گئیں، اور پٹھاناں خاں کا معاملہ یہ ہے کہ خواجہ فرید کی کافیوں میں مگن ہے۔ کسی اور کام سے مطلب نہیں کوئی چیز گانے کی خواہش نہیں۔ سارا فن خواجہ کی کافیوں کے لئے وقف ہے۔ ریاض انور کا اصرار ہے کہ خواجہ فرید کے اس عاشق کو مَیں نے دریافت کیا ہے۔ میں نے اسے دریائے سندھ کے کنارے کافیاں گاتے دیکھا، اس کے جذب و عشق نے مجھ پر اثر کیا، مَیں نے اسے وہاں سے اٹھایا اور ملتان کے جشنِ فرید میں لا بٹھایا۔

پٹھاناں خاں اب ملتان سے نکل کر لاہور آیا اور پاکستان کونسل میں آکر محفل کو لُوٹ لیا۔ ؎ ہے عشق دا جلوہ ہر ہر جا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ

ایک خاتون یہ سنتے سنتے اتنی بے تاب ہوئیں کہ اپنی جگہ سے اٹھیں، فن کار کو سو روپے کی رقم نذر کی اور محفل سے نکل گئیں۔ قیوم نظر پیچھے دوڑے مگر اس خاتون نے کہا کہ اب اس کافی کے بعد بیٹھنے کی کیا گنجائش رہی۔

ڈاکٹر نذیر بھی تو آخر اہلِ درد ہیں۔ بیس روپے انہوں نے بھی نذر کئے۔ پاکستان کونسل کی محفل میں نذر کرنے کا دستور تو نہیں تھا۔ مگر عقیدتمندی دستور کو کب دیکھتی ہے۔

یہ اس محفل کا ایک پہلو تھا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ خواجہ فرید کی شاعری پر مقالے پڑھے گئے۔ ارشد ملتانی، ریاض انور اور سید علی عباس جلالپوری نے اپنے اپنے حساب سے باتیں کیں۔ اسی ایک شاعری میں سے ریاض انور نے خالص عشقیہ واردات اخذ کی اور سیّد علی عباس جلالپوری نے خالص تصوف کشید کیا۔

ریاض انور کہتے تھے کہ خواجہ فرید نے عشقِ حقیقی کا مضمون صرف چالیس کافیوں میں باندھا ہے باقی کافیاں عشقِ مجازی کی داستان ہیں۔ اس داستان کی مخصوص کیفیت انھوں نے انتظار کی کیفیت بتائی جو کافیوں میں جا بجا اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ مگر یہ کہ اس انتظار میں اضمحلال کا رنگ نہیں ایک توانائی ہے۔ ریاض انور نے یوں ثابت کیا کہ یہ کافیاں ذاتی دکھ کا بیان نہیں بلکہ شاعر نے ہم سب کے دکھوں کو آواز عطا کی ہے۔ مگر چلتے چلتے

یہ اشارہ بھی کیا کہ خواجہ فرید نے زندگی میں عشق کی چوٹ بھی کھائی تھی۔ اس چوٹ نے بھی اپنا اثر دکھایا ہے۔

اس کے بعد سید علی عباس جلالپوری آئے انھوں نے ریاض انور کو فلسفہ کی مار دی اور خواجہ فرید کی شاعری کی اس طرح توجیہہ کی کہ عشق حقیقی ہی رہ گیا اور عشق مجازی بالکل غائب ہوگیا۔ انھوں نے بتایا کہ سستی کا مطلب ہے رُوح اور پنوں کا مطلب ہے معشوقِ حقیقی۔ اب بتایئے کہ ریاض انور کی تنقید کہاں ٹھہرتی ہے جس نے صرف چالیس کافیوں میں عشقِ حقیقی کی نشان دہی کی اور باقیوں کو عشقِ مجازی کے خانے میں ڈال دیا۔ شاعری سے تصوف برآمد کرنے والے بھی ایسی کچی گولیاں کھیلے نہیں ہوتے کہ ریاض انور جیسے نقادوں سے پٹ جائیں۔ وہ تو عشقِ مجازی کے بیان ہی میں سے عشقِ حقیقی کا استعارہ اس طرح کشید کرتے ہیں کہ یار لوگ منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ اب یوں غور کرو کہ داؔغ کو یاروں نے عشقِ مجازی کا شاعر جانا اور ان کی غزلوں کا رشتہ بازارِ حسن سے جا ملایا۔ عاشق پیشہ لوگ داؔغ کا یہ شعر کس مزے سے پڑھا کرتے تھے۔ ؎

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

مگر محمد حسن عسکری نے داؔغ کی شاعری سے کھینچ کھینچ تصوف نکالا اور اس ٹھیٹھ مجازی شعر سے عشقِ حقیقی کا استعارہ برآمد کیا۔

داغ کی شاعری سے تصوف برآمد کرنے کا واقعہ حالیہ واقعہ ہے۔ مگر حافظ شیرازی کے کلام سے ایک عرصہ دراز سے تصوّف نکالنے کا سلسلہ جاری ہے۔ کسی تن جلے نے حافظ کا یہ شعر تصوّف پسند نقّادوں کے جواب میں پیش کیا ؎

مئے دو سالہ و محبوب چاردہ سالہ
ہمیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر

اور سوچا کہ یہاں تصوف پسند نقاد مار کھائے ہی کھائے اس لئے کہ یہاں تو مدت اور عمر کی قید بھی لگ گئی ہے۔ شراب جب صرف دو سال پُرانی ہو تو وہ شرابِ معرفت کیسے ہو جائے گی۔ اور محبوب جب چودہ سالہ ہو تو پھر تو وہ گوشت پوست والا ہی محبوب ہو سکتا ہے۔ مگر توبہ کیجئے۔ تعبیر کرنے والوں نے ان دونوں کی ایسی ایسی تعبیریں کیں کہ اگر ہم انہیں یہاں نقل کر دیں تو اسلام پسند ان بزرگوں کو چھوڑ کر پنجے جھاڑ کر ہمارے پیچھے پڑ جائیں۔

تو یہ قصہ آج کا نہیں ہماری شاعری کے دم کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ مجاز پرست سسّی کو سسّی اور ہیر کو ہیر سمجھتے ہیں۔ سید علی عباس جلالپوری کے لئے سسّی، ہیر، رادھا، یہ سب استعارے ہی استعارے ہیں۔ خیر تو اس تقریب میں خواجہ فرید کی شاعری کی دونوں ہی تعبیریں ہمارے سامنے آ گئیں اب شاعری کا کوئی سمجھدار نقاد جانچ پرکھ کر یہ بتائے کہ خواجہ فرید کی شاعری میں مجاز اور حقیقت کس طرح گھل مل کر ایک سچائی بنے ہیں +

(۱۹۸۱ء)

کارواں جس نے ڈھاکہ سے آغازِ سفر کیا تھا،

ابھی بہار کے دن باقی ہیں۔ مگر صاحب دلوں کی زبان پہ ہم نے یہ مصرعہ جاری دیکھا ع

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے

آج ۳ر مارچ ہے۔ ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی چلتی ہے۔ اس ہوا میں بہار کی مہک ہے۔ دن تو یارو یہ بہار ہی کے ہیں۔ مگر وہ بہار جس کا انتظار تھا، نہ آئی۔ وہ قومی مجلس جس سے سینکڑوں تمنائیں وابستہ کی گئی تھیں بس منعقد ہوتے ہوتے رہ گئی۔

وہ جو ڈھاکہ جانے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ کتنے خوش تھے۔ خوش ہونے والوں میں ہمارے چند اخباری دوست تھے۔ جیب میں ہوائی جہاز کے ٹکٹ تھے اور اتراتے پھرتے تھے۔ آج ۳ر مارچ کی صبح ہی صبح ہماری ایک یار سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے پوچھا کہ سناؤ اب کس منزل میں ہو۔ بولے کہ کالی پلی

رستہ کاٹ گئی۔ رستہ کھوٹا ہو گیا۔ اب ہاتھ پاؤں توڑے بیٹھے ہیں۔

پان خوروں کی ایک محفل میں گئے۔ وہاں یاروں کو دوسری ہی تشویش میں مبتلا دیکھا۔ ایک نے فکرمندانہ سوال کیا کہ بھائی پانوں کا اب کیا ہوگا۔ دوسرا بولا کہ بھائیو پان کا مستقبل مخدوش ہے۔

دوسری محفل میں گئے۔ یہاں ایک دانشور صاحب سرگرم گفتار تھے۔ ثابت کر رہے تھے کہ مشرقی پاکستان کی تو تہذیب ہی الگ ہے

تیسری محفل میں پہنچے۔ وہاں کچھ بے فکرے بیٹھے تھے۔ ایک بے فکرا کہہ رہا تھا کہ اب بنگالی راہِ راست پر آجائیں گے۔ ہم نے یاروں کی باتیں سنیں اور حیران ہو کر سوچا کہ ع

ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

اور یارو یہ کیا اندازِ فکر ہے اور یہ کیا اندازِ بیان ہے کہ جیسے مشرقی پاکستان کے لوگ ہم سے الگ ہیں، اور انھیں راہِ راست پر آنا ہے۔ راہِ راست پر تو ہم سب ہی کو آنا ہے۔

ہم نے اس دانشور دوست کے استدلال پر غور کیا جو یہ کہہ رہا تھا کہ مشرقی پاکستان ایک الگ تہذیبی وحدت ہے اور مغربی پاکستان ایک الگ وحدت ہے۔ اور ہمیں یاد آیا کہ ہمارے انھیں دوستوں نے اب سے پہلے ہم سے یہ استدلال کیا تھا کہ مشرقی پاکستان میں سی آئی اے برسرِ عمل ہے اور

وہاں لوگوں میں مغربی پاکستان والوں کے خلاف نفرت پھیلا کر دونوں بازوؤں کی علیحدگی کے سامراجی منصوبے کو بروئے کار لانا چاہتا ہے۔ اور ہم نے حیران ہو کر سوچا کہ جو سی آئی اے سے دوسروں کو خبردار کرتے ہیں وہ خود کتنی آسانی سے سی آئی اے کے دام میں پھنس جاتے ہیں۔

صاحبو غور کرو کہ کارواں کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا۔ وہ زمانہ یاد کرو جب ڈھاکہ میں ۱۹۰۶ء میں ملت کے چارہ گر جمع ہوئے۔ ان میں کوئی دلی کا تھا کوئی پنجاب کا کوئی بنگال کا، کوئی سندھ کا۔ کل ہند مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ بنگالی رہنما نواب سلیم اللہ خاں صدر ہوئے۔

۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء تک یہ کارواں کن کن منزلوں سے گزرتا، کن کن دشوار گزار گھاٹیوں کو طے کرتا کہاں تک پہنچا۔ اس سفر میں اپنی الگ قومی حیثیت کا شعور منزل بہ منزل منور ہوتا چلا گیا۔ علامہ اقبال نے یہ دعویٰ کیا کہ ہندوستان کے مسلمان نہ صرف یہ کہ ایک الگ قوم ہیں بلکہ ہندو قوم کے مقابلہ میں زیادہ قومی یک جہتی رکھتے ہیں اور قائدِ اعظمؒ نے یہ اعلان کیا ہندوستان کے مسلمان اپنی تاریخ کے اعتبار سے اپنی تہذیب کے اعتبار سے اپنے عقائد و افکار اور اپنے رسم و رواج کے اعتبار سے ایک الگ قوم ہیں۔

تحریک پاکستان کی یہ نظریاتی بنیاد تھی اور اس بنیاد پر ایک ملک وجود میں آیا۔ ملک جب وجود میں آگیا تو پھر کیا ہوا۔ یہ عجب ماجرا ہے کہ مسلمانوں نے

محکومی کے زمانے میں اپنی قومی شناخت کی اور آزادی کے بعد اپنی قومی شناخت کو گم کرنا شروع کیا۔

قومی شناخت تو وہیں سے گم ہونی شروع ہو گئی تھی جب پاکستان میں جمع ہو جانے والے مسلمانوں نے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو فراموش کیا اور انھیں غیر قوم تصور کرنا شروع کیا۔ خیر ان کا کیا ذکر کہ وہ تو بہت پیچھے رہ گئے اور گردِ کارواں بن گئے۔

سختیِ کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

مگر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان تو ایک ہی ملک ہیں۔ سو اس نوزائیدہ غیریت کے کیا معنی ہیں۔ ڈھاکہ ۱۹۰۷ء میں کیا تھا اور ۱۹۴۷ء میں کیا تھا، اور ۱۹۷۱ء میں کیا ہوتا جا رہا ہے۔

ڈھاکہ میں تو جو ہو رہا ہے وہ ہو رہا ہے مگر یارو لاہور میں کیا ہو رہا ہے۔ کیا تحریکِ پاکستان کے زمانے میں اس شہر میں بیٹھ کر یہ سوچا جا سکتا تھا کہ بنگال کے مسلمان ایک الگ تہذیبی وحدت ہیں اور کیا ان کے بارے میں اس رنگ سے باتیں کی جا سکتی تھیں جیسے وہ الگ قوم ہوں۔ اگر ہم اس بنیاد کو تسلیم کرتے ہیں جس بنیاد پر پاکستان بنا تھا تو پھر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان ایک تہذیبی وحدت ہیں اور

ایک قوم ہیں۔ اگر اس بنیاد سے انکار ہے تو معاف کیجیے آگے چل کر یہ پتہ چلے گا کہ مغربی پاکستان بھی ایک تہذیبی وحدت نہیں ہے۔

یہ تو سیاسی مبصرین جانیں کہ مشرقی پاکستان میں کیا ہونے والا ہے۔ ہم تو بس ایک بات جانتے ہیں کہ ہنگامی جذباتی صورت حال خواہ وہ اپنے کرتوتوں سے پیدا ہو یا سامراجی سازشوں کا کرشمہ ہو وہ آشوب تو پیدا کر سکتی ہے مگر تاریخی حقیقتوں کو نہیں بدل سکتی اور تاریخی حقیقت یہ ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان مل کر ایک تہذیبی وحدت ہیں اور ان میں بسنے والے لوگ ایک قوم ہیں اور اگر اغیار کے کہنے میں آ کر اس تاریخی حقیقت کو مسخ کر دیا جائے تو پھر انا للہ و انا الیہ راجعون۔

(۳/۱/۴۷)

ایک پاکستان، دو پاکستان، پانچ پاکستان

جنرل ڈیگال نے آندرے مالرو کا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ اب اس میں شک کی گنجائش نہیں رہی کہ ہم تم یورپ کو مرتا ہوا دیکھ رہے ہیں

آندرے مالرو کہ فرانس کے نامی گرامی ادیب ہیں. جنرل ڈیگال کے آخری ایام میں بہت وقت ان کے ساتھ رہے. خبر یہ ہے کہ اس شخصیت کے متعلق ان کی کتاب شائع ہو گئی ہے. اور اس میں یہ واقعہ درج ہے.

یہ واقعہ یہاں اس تقریب سے نقل کیا گیا کہ اس ملک میں اور اس شہر میں بھی کچھ ایسے لوگ ابھی زندہ ہیں جنھوں نے ایک شعور کو اسی آب و تاب سے فروغ پاتے دیکھا جس آب و تاب سے ڈیگال نے یورپ کو فروغ پاتے دیکھا تھا. اور اب وہ اس شعور کو مرتے ہوتے دیکھ رہے ہیں. ایسے لوگ ابھی زندہ ہیں جنھوں نے علامہ اقبالؒ اور مولانا ظفر علی خاں کا زمانہ دیکھا تھا جنھوں نے شاید تحریکِ خلافت کا زمانہ بھی دیکھا. جنھوں نے خاکسار تحریک دیکھی، تحریکِ پاکستان دیکھی اور جنھوں نے

قیام پاکستان کی وہ گھڑی دیکھی جب پنجابی، بنگالی، سندھی، بلوچی، پٹھان مہاجر سب کے دل ایک طرح دھڑک رہے تھے۔ اور اب وہ بزرگ اس پوری تاریخ کو اپنے سامنے مرتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ ان کے لبوں پر بھی کچھ عبرت بھرے کلمات ہیں۔ مگر یہ کہ ان کے آس پاس کوئی مالرد نہیں۔ جو اس وقت کی سیاسی دھما چوکڑی سے الگ ہو کر سکون سے ان کی بات سُنے اور جرأت اور دیانت سے اسے قلم بند کرے۔

ایک بوڑھے شخص نے اس سارے بحران پر کیا عجب تبصرہ کیا کہ:

"میاں تمہارا پاکستان تو شاید بچ ہی جائے گا مگر میں اپنے پاکستان کو مرتے دیکھ دیکھ رہا ہوں۔ وہ مجھے بچتا نظر نہیں آتا۔"

ایک صاحبِ دل کو ہم نے یہ کہتے سُنا کہ مشرقی پاکستان تو نہیں ٹوٹے گا مگر دھاگا ٹوٹ گیا اور اصلی چیز تو وہ دھاگا تھا۔"

ایک صحبت میں بحث گرم تھی کہ ایک پاکستان یا دو پاکستان۔ دلائل سب کے پاس عجب اور نرالے تھے۔ کسی نے کہا کہ ایک پاکستان کے نام پر پانچ پاکستان بننے سے بہ زیادہ اچھا ہے کہ دو پاکستان بن جائیں۔

ایک تن جلا بولا کہ جیتے جاگتے آدمی کے تلوار مار کر تم دو ٹکڑے کر دو۔ اور کہہ دو کہ یہ دو آدمی ہو گئے۔ میاں ایک آدمی یا تو ایک آدمی ہوتا ہے۔ یا پھر وہ نہیں ہوتا۔

ویسے ایسی باتیں سننے کے لئے آجکل کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔ یہ ایسا زمانہ ہے جب نعرہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے مگر بات آسانی سے نہیں کی جا سکتی۔ کسی نے بات کرنے کے لئے زبان کھولی اور دوسری طرف سے آواز آئی "سی آئی اے کا ایجنٹ"۔ ہم نے مختلف موقعوں پر شرفا کو زبان کھولتے دیکھا۔ اور سی آئی اے کا ایجنٹ کہلا کر رسوا ہوتے دیکھا۔

ایک دوست ہم سے پوچھنے لگا کہ "یار اس ملک میں کوئی ایسا فرد بچا ہے جسے کسی نہ کسی وقت سی آئی اے کا ایجنٹ نہ کہا گیا ہو۔ سیاسی رہنماؤں میں سے تو کوئی بچا ہوا نظر آتا نہیں ہے"۔

اس پر کسی نے کیا خوب ٹکڑا لگایا کہ اگر کوئی ایسا بچ گیا ہے جس پر یہ الزام نہیں لگا، تو اس پر زیادہ شک کرو، کہ اس کے ایجنٹ ہونے کا زیادہ امکان ہے۔ جب سب ہی آدمی مشکوک ٹھہریں تو مشکوک آدمی کا پتہ چلانا کتنا دشوار ہو جاتا ہے۔ باتوں میں تو آدمی بالآخر چغلی کھا جاتا ہے مگر نعروں میں آدمی اپنے آپ کو آسانی سے چھپا لے جاتا ہے۔

ایک صاحب ہم سے کہنے لگے کہ "عجب بات ہے میں آجکل بعض ایسے لوگوں کو سالمیت پاکستان کا نعرہ لگاتے دیکھ رہا ہوں جو اب سے پہلے اس نعرہ کو فریب قرار دیا کرتے تھے"۔

اس پر دوسرے صاحب ہنسے اور بولے کہ "تم سالمیت پاکستان

کے نعرے کی بات کرتے ہو میں نے ایسے کردار بھی دیکھے ہیں کہ کل تک مذہب کو دلائل و براہین کے ساتھ رد کرتے تھے اب کلام پاک کی آیات بصد رقت پڑھتے ہیں اور ان کی تفسیریں کرتے ہیں۔

سالمیتِ پاکستان کے نعرے کا معاملہ ان دنوں یہ ہے کہ وہ کسی کو راس آجاتا ہے اور کسی کو رسوا کر جاتا ہے کسی کے اس نعرے پر یاروں نے کہا کہ یارو اس کی بات سُنو وہ سالمیتِ پاکستان کی بات کرتا ہے۔ کسی دوسرے نے یہ نعرہ بلند کیا تو شور مچا کہ یہ امریکہ کی آواز ہے۔

اِس فضا میں کون سا نعرہ کتنی دیر قابلِ اعتبار رہ سکتا ہے یہ بے یقینی کی فضا ہے۔ ہر آدمی کو ہر آدمی پر شک ہے۔ ایک دوست نے پوچھا کہ "پھر اِن دنوں کیا کیا جائے"۔ ہم نے کہا کہ "مولانا حالی نے کسی بھلے وقت میں ایک مناجات لکھی۔ وہ پڑھا کرو"۔

اُس نے کہا "مولانا حالی پر دل نہ جمے تو؟"

ہم نے کہا کہ "علامہ اقبال نے ایسے وقت کے لئے کچھ اشعار لکھے ہیں۔ کم از کم اس مصرعہ کو گنگنا لیا کرو۔ ع شیرازہ ہوا اُمّتِ مرحوم کا ابتر۔ اے روحِ محمدؐ"

اُس دوست نے ہمیں کڑوی نظروں سے دیکھا اور کہا "مولانا حالی، مناجات، علامہ اقبال۔ یہ کس روایت، کس تاریخ کا تم ذکر کر رہے ہو۔ یہ تاریخ تو اب گم ہے۔"

(۱۵/۳/۷۱)

شاکر علی سے چارپائی کے پایوں تک

آثارِ قدیمہ صدیوں کی تاریخ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مگر کتنی خوشی کی بات ہے کہ پاکستان نے اپنی تیئس سالہ تاریخ ہی میں بہت سے آثارِ قدیمہ پیدا کرلیے یقین نہ آئے تو لاہور کے عجائب گھر میں جاؤ اور پاکستانی مصوری کی نمائش دیکھ لو۔

ہم سوچا کرتے تھے کہ عجائب گھر کو اب یکایک یہ کیا ہو جھی ہے کہ اُس نے اپنے یہاں تقاریب کا اہتمام کرنا شروع کر دیا۔ تقاریب ہمعصر زندگی کا معاملہ ہیں عجائب گھر گذری ہوئی اور گمشدہ صدیوں کی فضا میں سانس لیتا ہے۔ سو جب کسی تقریب کے حوالے سے یہاں ماضی اور حاضر اکٹھے ہوتے ہیں تو عجب انمل بے جوڑ صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ آپ تصوّر کیجیے۔ اس صورتِ حال کا اِرد گِرد عہدِ قدیم کے ایرانی نوادرات اور مغل آثار سجے ہیں۔ کہیں کوئی پرانا سا جگ رکھا ہے۔ کہیں کوئی شاہی پوشاک ٹنگی ہے۔ کہیں صدیوں پرانا قالین آراستہ ہے۔ اور بیچ میں سید عبداللہ کھڑے ٹیکسٹ بک بورڈ کی کتابوں پر گفتگو کر رہے ہیں۔ یا چار دن

طرف بھکشوؤں کے مجسمے سجے ہیں اور ہم فاقہ کش بدھ کی بغل میں کھڑے کیک کھا رہے ہیں اور منتظمین بھی ایسے ستم ظریف ہیں کہ چائے کا اہتمام اودا گر گندھارا آرٹ کے ایوان میں کرتے ہیں۔ جہاتما بدھ نے فاقہ کشی کر کے نروان حاصل کیا تھا۔ ہمیں یہاں چائے کے ذریعے مکتی ملتی ہے۔ اس سے پہلے تپسیا ہوتی ہے۔ یعنی مقررین تقریریں کئے جا رہے ہیں اور ہم سنے جا رہے ہیں۔

مگر اس مرتبہ ہمعصر مصوری کی نمائش دیکھنے کے بہانے ہم عجائب گھر پہنچے اور کسی انمل بے جوڑ صورت حال کا احساس نہ ہوا۔ بلکہ نمائش دیکھتے دیکھتے ایک تسکین سی ہوئی کہ اچھا وہ مصور جو ہمارے دیکھتے دیکھتے پیدا ہوئے اور دیکھتے دیکھتے غائب ہوئے معدوم نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ آثارِ قدیمہ بن گئے ہیں۔ یہ اس نسل کے مصوروں کا ذکر ہے جو پاکستان بننے کے چند سال بعد سمجھ لیجئے کہ ۵۰ء کے بعد کے برسوں میں پیدا ہوئی تھی اور اپنی مصوری کو نئی مصوری بتاتی تھی۔ یہ مصور رفتہ رفتہ نئے پرانے ہوتے گئے اور بکھرتے گئے۔ کوئی منہ اٹھا کر لندن کی طرف نکل گیا۔ کوئی شہر میں بیٹھے بیٹھے ہی تہذیبی دنیا کے حافظے سے اتر گیا۔ کوئی تاجر بنا۔ اور پھر سیاست کی گائے اُسے چر گئی۔ بات آئی گئی ہوئی مضی ماضی مگر عجائب گھر میں ہمعصر مصوری کی نمائش سجی تو اس گذرے زمانے کے ایسے مختلف نمونے وہاں سجے نظر آئے۔

استاد اللہ بخش اور چغتائی کی بات چھوڑو۔ وہ نہ کبھی نئے نظر آئے

نہ کبھی پرانے ہوئے۔ پاکستان میں جب سے مصوری کی نمائشیں شروع ہوئی ہیں۔ اس وقت سے یہ بزرگ اپنی اسی ایک شان کے ساتھ نظر آرہے ہیں۔ وقت ان کے موقلم کی زد میں آکر ٹھہر گیا ہے۔ مگر نئے مصور تو بدلتے وقت کا تاثر پیش کر رہے تھے۔ اب جو اتنی مدت کے بعد ہم نے پاکستان کی مصوروں کی اس پہلی نسل کو دیکھا تو لگا کہ وقت یہاں بھی کچھ ٹھہر ہی گیا ہے۔ خیر اسی نسل کے کچھ ایسے مصور بھی تھے جو یہاں دونوں طرح سے اس زمانے سے نکل کر اس زمانے میں زندہ ہونے کا ثبوت دے رہے تھے۔ یعنی وہ یہاں بنفسِ نفیس موجود تھے۔ اور ان کی تصویریں بھی یہاں وہ سجی تھیں جو اس اولیں زمانے کے بعد کی تخلیقات ہیں۔ شاکر علی، انیس صفدر، معین نجمی معہ اپنی تصویروں کے یہاں موجود تھے۔

شاکر علی کو اس نمائش میں چلتے پھرتے ہم نے بہت غور سے دیکھا۔ وہ خود تو عجائب گھر کی فضا کا حصہ نظر آرہے تھے مگر ان کی تصویریں اس فضا میں اکھڑی اکھڑی نظر آرہی تھیں۔ شاکر علی کو گندھارا آرٹ کے ایوان میں دیکھ کر کون یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ اس ایوان کے مکین نہیں ہیں۔ مگر ان کی تصویریں اس چوکھٹے میں نہیں کھپ رہی تھیں ـــــ

مگر اس نسل کے بعد بھی کچھ نسلیں آئی ہیں۔ ان کی تجریدی مصوری شاکر علی کی تجریدی مصوری سے مختلف نظر آئی۔ مثلاً شاکر علی کے تصور میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ تصویر کے اندر چارپائی کے پائے بھی فٹ کیے جا سکتے ہیں۔

شاکر علی کا تخیل تو ایک مقام پر آکر ٹھہر گیا تھا۔ اس سے آگے ظہور الاخلاق کے تخیّل نے زقند لگائی۔ انھوں نے چارپائی کے چار پائے لئے اور تصویر کے اندر چسپاں کر دیئے۔

اس نمائش کا افتتاح بیگم عتیق الرحمٰن نے کیا اور کس سلیقہ سے کیا کہ ناظرین اور تصویروں کے درمیان مطلق حائل نہیں ہوئیں۔ حائل جتنا ہونا تھا وہ بی۔ اے قریشی صاحب ہوئے۔ مگر زیادہ نہیں۔ انھوں نے مختصر سی تقریر کی۔ اس کے بعد بیگم صاحب نے نمائش کا افتتاح کیا۔

(۱۳ دسمبر ۷۱ء)

تاریخ لکھنے کا ایک منصوبہ

یوم آزادی کی ایک رسم یہ بھی تو چلی آتی ہے کہ سٹیج پر کھڑے ہوکر پورے قومی جوش کے ساتھ کچھ عزائم کا اعلان کیا جاتا ہے۔ کچھ منصوبے پیش کیے جاتے ہیں۔ ۱۴ راگست کو جب یہ رسم انجام پا رہی تھی تو ہماری مڈبھیڑ چند دانشوروں سے ہوگئی۔ کہنے لگے کہ چوبیس برسوں میں بہت گھپلا ہوگیا۔ ہم نے کہا کہ پھر کیا کیا جائے۔ بولے کہ اب پاکستان کی نئی تاریخ لکھی جانی چاہیئے۔ ہم نے کہا کہ لکھو۔ بولے کہ خاکہ بنانے ہیں پھر اس میں رنگ آمیزی کریں گے۔ خیر پہلے تم بتاؤ کہ کن خطوط پر پاکستان کی تاریخ لکھی جائے۔

ہم نے ازراہ سادہ دلی عرض کیا کہ بھئی پہلے یہ سوچنا چاہیئے کہ تحریک پاکستان کے محرکات کیا تھے۔ بولے محرکات تو صرف اقتصادی تھے مگر شاید اس کے علاوہ بھی کچھ اور محرکات ہوں۔ یوں دیکھ لیتے ہیں کہ اس زمانے میں کن اقدار کے تحفظ کی فکر مسلمانوں کو زیادہ پریشان کر رہی تھی اور کس طرح اس سے تحریک

پاکستان کو تقویت پہنچی۔ بس کہیں انہی باتوں میں ہمارے منہ سے ہند اسلامی تہذیب کا نام نکل گیا۔ انھوں نے ہمیں گھور کے دیکھا۔ بولے رسّی جل گئی پر بل نہ گئے۔ اس تصور کا ہم نے کبھی کا کریا کرم کر دیا کوئی اور بات کرو۔

ہم نے کہا اچھا۔ اس زمانے کے سیدھے سیدھے نعرے لئے لیتے ہیں۔ مثلاً اسلام، اردو زبان، انہوں نے پھر ہمیں گھورا۔ ایک بولا۔ کہ صاحب اسلام کا نعرہ تو سٹریٹیجی (STRATEGY) تھا۔ اس نعرے کے بغیر مسلمان متحد نہیں ہو سکتے تھے۔ ہم نے پوچھا، اور اُردو زبان۔ بولے کہ وہ نعرہ بھی سٹریٹیجی تھا۔ ہم نے کہا کہ اچھا پھر یوں چلتے ہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے قائدِ اعظم کی قیادت میں پاکستان کا نعرہ بلند کیا اور مسلمانوں کو منظم کر کے تحریک چلائی۔ دانشور پھر کسمسائے۔ بولے کہ مسلم لیگ کے گڑے مردے کو اکھاڑنے کی اب کیا ضرورت ہے۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ تاریخ تو بہر حال تاریخ ہے۔ بولے کہ ایسی تاریخ تو گڑبڑ پیدا کرے گی۔

دانشور نمبر ۱۔ یار مسلم لیگ کا ذکر تاریخ سے خارج کر دو۔

دانشور نمبر ۲۔ بالکل درست۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔

دانشور نمبر ۳۔ پھر خان اعظم اور میاں ممتاز دولتانہ دونوں بین بجائیں گے۔

ہم نے کہا کہ بھئی سیاسی جد و جہد کا اسلوب بالعموم یہی دیکھا گیا ہے کوئی لیڈر ہوتا ہے کوئی جماعت ہوتی ہے اس کے ذریعے رائے عامہ منظم ہوتی ہے۔

اور اپنا اظہار کرتی ہے۔ اور اس زمانے میں کانگریس سے قائدِ اعظم کی ایک لڑائی یہ بھی تھی کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے۔ اس پر ایک دانشور سر پکڑ کر بولا کہ یار قائدِ اعظم ہماری راہ میں بہت کانٹے بو گئے ہیں۔ دوسرا بولا کہ خیر اس وقت کی اس وقت سے رہی۔ اب یوں استدلال کریں گے کہ پاکستان مسلمان عوام نے بنایا تھا۔

ہم نے عرض کیا کہ اچھا یوں چلتے ہیں کہ علامہ اقبال نے تصورِ پاکستان پیش کیا۔ قائدِ اعظم نے اس بنیاد پر تحریک شروع کی۔

دانشور نمبر ۱۔ یک نہ شد دو شد۔ علامہ اقبال بھی اور قائدِ اعظم بھی۔

دانشور نمبر ۲۔ صاحب دو نہیں چلیں گے ایک کو کاٹ دو۔

ہم ۔ کیسے کاٹا جائے۔

دانشور نمبر ۲۔ مناسب یہ ہے کہ قائدِ اعظم کو کاٹ دیا جائے۔

ہم نے کہا کہ اچھا تو پھر ہم استدلال یوں کریں گے کہ علامہ اقبال نے اپنی شاعری سے مسلمان عوام کے دلوں کو گرمایا اور پھر تصورِ پاکستان پیش کیا۔

دانشور نمبر ۱۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ علامہ اقبال عوامی شاعر تھے۔

دانشور نمبر ۲۔ یہ تو ہم نہیں مانیں گے۔

دانشور نمبر ۱۔ تو پھر کیوں نہ علامہ اقبال کو بھی قلمزد کر دیا جائے۔

دانشور نمبر ۲۔ بالکل درست ہے۔

ہم نے کہا کہ اچھا بھئی جماعت بھی غائب اور شخصیتیں بھی غائب۔ آغازِ کلام یوں کرتے ہیں کہ ایک تھا دو قومی نظریہ۔ ایک دانشور نے فوراً ہماری زبان پکڑ لی۔

" دو قومی نظریہ کیا؟"

دوسرا بولا۔ یار بڑھی صاحب کا تو منہ کیا ہوتا۔ جب ایک دانشور نے یہ کہہ دیا کہ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ نہیں تھا۔ بلکہ انڈین یونین سے ایک معاہدہ اس کی بنیاد تھا۔ تو اب اس میں چون وچرا کی کیا گنجائش رہ گئی۔ بس مان لو۔

ہم نے کہا۔ چلو مان لیا۔ پھر کیسے بات شروع کریں۔ جواب ملا کہ ماضی پرست مت بنو۔ ماضی کو جتنا چھانو گے اتنا کرکرا نکلے گا۔ آغاز یہاں سے کرو کہ پاکستان بن گیا۔ ہم نے کہا بن گیا، اچھا پھر۔ بولے کہ اب یہاں سے حقیقی مسائل کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ مثلاً قومی زبان کا۔

دانشور نمبر ا۔ پہلے اردو کا شوشہ اٹھا۔ پھر بنگلہ کا سوال پیدا ہوا۔

دانشور نمبر ۲۔ یک نہ شد دو شد۔

دانشور نمبر ۳۔ یہاں اس مثل کا اطلاق نہیں ہوتا۔

دانشور نمبر ا۔ بہرحال میرا خیال پہلے یہ تھا کہ قومی زبان ایک ہی ہونی چاہیے اور میری تجویز بھی کہ اردو کو کاٹ دیا جائے۔ مگر ان دنوں میں اینٹی بنگالی ہوں۔

دانشور نمبر ۲۔ پھر کیا کیا جائے

دانشور نمبر ا۔ دونوں کو کاٹو، انگریزی چلے گی۔

ہم نے کہا کہ چلو ایک مسئلہ تو طے ہوا۔ اب آگے چلو۔ سوال اٹھا کہ قوموں کے کچھ ہیرو ہوا کرتے ہیں۔ پاکستانی قوم کے ہیرو کون کون ہوں گے۔ ہم نے عرض کیا کہ ایک، تو محمد بن قاسم کا نام لکھے لیتے ہیں۔

دانشور نمبر ۱۔ محمد بن قاسم نہیں چلے گا۔

دانشور نمبر ۲ پھر کس کا نام چلنا چاہیئے۔

دانشور نمبر ۱۔ راجہ داہر کا۔ اس طرح سے سندھ والوں کے بھی گلے شکوے دور ہو جائیں گے۔

دانشور نمبر ۲۔ ویسے اگر قومی ہیرو کی بجائے قومی ہیروئن دستیاب ہو جائے تو کیا برا ہے۔

آوازیں۔ سبحان اللہ، جلدی نام بتاؤ۔

دانشور نمبر ۲۔ موہنجوداڑو کی رقاصہ؛ آوازیں۔ بالکل ٹھیک بالکل ٹھیک۔

ہم نے عرض کیا کہ اس میں تھوڑی قباحت یہ ہے کہ یہ مجسمہ ہندوستان کے قبضہ میں ہے۔ اس پر یار افسردہ ہوئے اور بولے کہ ہندوستان نے کشمیر لے لیا تھا تو یہ مجسمہ ہی ہمارے پاس چھوڑ دیتا؛ دانشور نمبر ۱ خیر کوئی ہرج نہیں ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اس کا نام؛ آوازیں۔ بالکل ٹھیک بالکل ٹھیک؛ ہم نے کہا کہ اچھا تو بات یوں بنی کہ پاکستان میں ایک قوم ہے جس کی قومی ہیروئن موہنجوداڑو کی رقاصہ ہے؛ دانشور نمبر ۱۔ یار ہماری عوامی ادبی انجمن کا تو کچھ لحاظ کیا ہوتا۔ پاکستان میں ایک قوم نہیں بلکہ جتنے علاقے ہیں اتنی قومیں ہیں۔ تب ہم نے ٹھنڈا سانس لیا اور کہا یارو ہم چلے۔ پاکستان کی یہ تاریخ تم خود ہی لکھو+

جنگ ہوگی یا نہیں ہوگی؟

جنگ کا معاملہ اب سیاسی مبصروں کے ہاتھوں سے نکل کر منجموں کے ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے۔ سیاسی مبصروں نے لوگوں کو مایوس بھی تو بہت کیا۔ کتنی بار انھوں نے جنگ کی تاریخوں کا تعین کیا۔ اور کتنی بار مقررہ تاریخ آئی اور نکل گئی۔ یاروں کا اعتبار سیاسی مبصروں سے اٹھ گیا۔ اب وہ منجموں سے رجوع کر رہے ہیں۔ اور بتانے والے بتاتے ہیں کہ منجم بڑے وثوق سے جنگ کی تاریخ بتا رہے ہیں۔

یارو کیا بتائیں ہم تو مہینوں سے اس دبدا میں ہیں کہ جنگ ہوگی یا نہیں ہوگی۔ جس سے ملتے ہیں اسے اسی دبدا میں دیکھتے ہیں۔ اب تو یہ ایک مستقل سوال بن گیا ہے کہ جنگ ہوگی یا نہیں ہوگی۔ دو آدمی جب ملتے ہیں تو پہلے سلام علیکم وعلیکم السلام ہوتی ہے پھر مزاج پرسی۔ پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ کیوں صاحب جنگ ہوگی۔ کوئی قنوطی ہوا تو نفی میں سر ہلاتا ہے اور تلخ سے لہجہ میں کہتا ہے کہ ارے صاحب کیسی جنگ کوئی جنگ نہیں ہو رہی۔ کوئی رجائیت پسند ہوا تو کہتا ہے کہ جنگ ہوگی

اور مقرر ہو گی۔ اور پھر وہ جنگ کا ایسا سہانا نقشہ کھینچتا ہے کہ ہم دل ہی دل میں کہتے ہیں کہ کمبخت جنگ کہاں رستے میں رہ گئی۔ جلدی کیوں نہیں آتی۔

قنوطیوں کا معاملہ یہ ہے کہ انھیں ان کے بے صبرے پن نے قنوطی بنا دیا ہے۔ انھوں نے اپنے حساب اوقات مقرر کر لئے تھے کہ فلاں دن اور فلاں وقت تک بس جنگ ہونی چاہیے۔ جب وہ وقت گذر گیا تو انھوں نے اگلی کوئی تاریخ اپنے ذہن میں مقرر کی اور بے چینی سے اس تاریخ کا انتظار کرنے لگے جب وہ بھی تاریخ گذر گئی تو اگلی کوئی تاریخ مقرر کی۔ تاریخیں ٹلتی چلی گئیں اور مزاج میں قنوطیت کا رنگ پیدا ہوتا چلا گیا۔

آج ایک قنوطیت پسند سے ہماری مڈبھیڑ ہوئی اس نے بڑے طنز بھرے انداز میں پوچھا کہ کیوں بھائی جنگ کرا رہے ہو۔

ہم نے مذبذب سے انداز میں کہا کہ جنگ کا خطرہ تو نظر آتا ہے۔

قنوطی صاحب ہنسے اور بولے۔ آپ بہت بھولے بادشاہ ہیں جنگ اس وقت بھلا کیسے ہو جائے گی۔

ہم نے حیرت سے پوچھا کہ کیوں جناب اس وقت جنگ میں کونسی بات مانع ہے۔

بولے کہ ادھر اندرا گاندھی دورے پر نکلی ہوئی ہیں اور ادھر شمیم آرا عمرہ کرنے جا رہی ہیں۔ جنگ کہاں سے ہو جائے گی۔

جنگ کے بارے میں کبھی یقینِ کامل کبھی شک، کبھی خوش کن تصورات کبھی

اندیشہ ہائے دور دراز، یادوں کا کارواں عجب منزل میں بھٹک رہا ہے۔ غرضیکہ کبھی ایک رَو ایک طرف بہا کر لے جاتی ہے کبھی دوسری طرف بہا کر لے جاتی ہے۔ یکایک شور اُٹھتا ہے کہ جنگ سر پہ کھڑی ہے اب ہوئی اور اب ہوئی۔ یہ شور گلی گلی، محلہ محلہ پہنچتا ہے اور اس کے ساتھ ایک جھری جھری سی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ جب یہ رَو اٹھتی ہے تو ہم بھی سمجھتے ہیں کہ جنگ بس تلی کھڑی ہے۔ مگر یہ رو جلدی ہی اپنے نقطہ عروج پر پہنچتی ہے۔ پھر دوسری ہوا چل پڑتی ہے۔ عاقل بین الاقوامی سیاست کی پوری شطرنج سمجھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس وقت جنگ کیسے ہو سکتی ہے اور ہم قائل ہو جاتے ہیں کہ ہاں بھئی اس وقت جنگ کیسے ہو سکتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شہری دفاع والوں کا حال بھی ہمارا ہی سا ہے۔ جب جنگ کے خیال کی رَو چڑھتی ہے تو یہ لوگ بھی جماہی لے کر اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کسی کسی محلہ میں رضاکار نکلتے ہیں۔ چندہ مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خندقیں کھودیں گے۔ وہ بیچ بیچ خندق کھودنا شروع کرتے ہیں۔ مگر پھر مخالف رو چل پڑتی ہے اور رضاکار اپنے اپنے بیلچے سنبھال کر گھروں کو واپس ہو لیتے ہیں۔

صاحبو عجب بات ہے۔ جنگ کے خیال نے کیا دو رنگی پیدا کی ہے۔ سامان سو برس کا جاری ہے اور پل کی خبر نہیں۔ غالبؔ نے شعر تو بہت اچھا کہا تھا کہ

تو اور آرائشِ خمِ کاکل

میں اور اندیشہائے دور دراز

مگر غالب کے تصور میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ کبھی یہ اور تو اکٹھے ہو جاتے ہیں اور آرائشِ خمِ کاکل اور اندیشہائے دور دراز، دونوں عمل بیک وقت جاری رہتے ہیں ہم یاروں کو جنگ کے سلسلہ میں اندیشہائے دور دراز میں کبھی غلطاں دیکھتے ہیں۔ اور یکسوئی کے ساتھ آرائشِ خم کاکل میں بھی ہیجان دیکھتے ہیں۔

جنگ ایسی چیز تو نہیں جس کی تمنا کی جائے لیکن اگر جنگ کے امکانات واقعی پیدا ہو جائیں تو انفرادی اور اجتماعی طور پر اس کے لئے ایسی تیاری تو کی جائے کہ یہ مرحلہ آجانے پر آدمی استقامت سے اس قیامت کا مقابلہ کر سکے۔ مگر بھائی ہم تو اس شہر میں جنگ کی باتیں ہی باتیں دیکھتے ہیں باقی تو کوئی ایسے آثار نظر آتے نہیں۔ جس سے یہ ثابت ہو کہ یہاں بھی لوگوں کو جنگ کی سنگین صورت حال کا احساس ہے۔ یہی حال ہمارے یاروں کا ہے۔ یہی حال محکمہ شہری دفاع کا ہے تو ہمارا جی یاروں سے یہ پوچھنے کو جاہتا ہے کہ بھائی تم جنگ کو کیا سمجھتے ہو۔

ایک قصوری ثم لاہوری آج ہم سے کہہ رہے تھے کہ جنگ اب جلدی کرا دو۔ ہم نے پوچھا کہ بھئی تمہیں اتنی عجلت کیوں ہے۔ بولا کہ گھر پہ قصور سے آئے ہوئے مہمان بہت جمع ہو گئے ہیں۔ ایک دوست نے انہیں یقین دلایا کہ اب جنگ ضرور ہو گی اور نومبر کے تیسرے ہفتے میں ہو گی ہم نے پوچھا کہ بھائی تمہیں کیسے پتہ چلا۔ بولے کہ نجومیوں نے تاریخ مقرر کر دی ہے ہم نے کہا کہ ہم نجومیوں پر اعتبار نہیں کرتے۔ اس پر وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے "شبلی بی کام پر بھی اعتبار نہیں کرتے"۔ بتائیے کہ ہم اس پر کیا کہتے چپ ہو گئے +

توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

ایک بوڑھا شخص نسبت روڈ کے بیچ کھڑا روتا تھا اور کہتا تھا کہ لوگو مجھے بتاؤ کہ پاکستان کے ساتھ یہ کیا ہوا ہے۔

لوگ اس شخص کے گرد جمع ہونے لگے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ اس بوڑھے شخص کو سمجھا رہے تھے۔ مگر وہ بدستور گریاں تھا اور کہتا تھا کہ میں ایک ایک سے پوچھتا پھرتا ہوں۔ کوئی مجھے کچھ نہیں بتاتا۔ لوگو میں کہاں جاؤں اور کس سے پوچھوں کہ پاکستان کے ساتھ یہ ہوا کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ جب بغداد کا زوال ہوا تھا تو اہلِ درد بہت روئے تھے۔ اور اس اہلِ درد نے جسے شیخ سعدی کہتے ہیں، مرثیہ لکھا ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنیں
اے محمد گر قیامت می برآری سر ز خاک

سر برآ اور دیں قیامت درمیانِ خلق بیں

شیخ سعدی آج زندہ ہوتے تو یہی کچھ زوالِ ڈھاکہ پر کہتے کہ زوالِ ڈھاکہ زوالِ بغداد سے کم قیامت نہیں ہے۔ مگر اہلِ درد آج اس ملک میں بہت ہیں اس قیامت نے آج انھیں بھی درد مند بنا دیا جو کل تک تخت دل نظر آتے تھے۔

زوالِ ڈھاکہ کی سنائونی سن کر لوگ گھروں سے نکل پڑے پہلے ایک سکتہ طاری ہوا۔ ایک نے دوسرے کو متحیر نظروں سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے۔ پھر آنکھوں میں آنسو امنڈنے لگے۔ بیبیاں بیبیوں کے گھر گئیں، پُرسا دیا اور آنچل سے منہ ڈھانپ کر رو دیں۔ چائے خانوں میں یوں ہوا کہ قوم کے ساتھ جو دغا ہوئی ہے اس پر غیظ و غضب میں گفتگو کرتے کرتے کسی کا دل بھر آتا اور آنکھیں ڈبڈبانے لگتیں اور پھر اچانک محفل میں خاموشی چھا جاتی۔

اگلے روز سے جلوس نکلنے شروع ہو گئے۔ بڑوں کے جلوس، نوجوانوں کے جلوس، بچوں کے جلوس۔ بچوں کے ایک جلوس میں ایک عجب کتبہ نظر آیا۔ قائدِ اعظم کی تصویر، اس کے نیچے لکھا ہوا۔ قائدِ اعظم کا پاکستان کہاں ہے۔

شاہراہِ قائدِ اعظم پر جو جلوس رواں دواں تھے ان کے بیچ بیچ ایک اور منظر دیکھنے میں آیا۔ سپاہیوں کی کوئی جیپ گذرتی ہوتی تو لوگ جیپ کو روک لیتے پاکستانی فوج زندہ باد کے نعرے لگاتے۔ سپاہیوں سے گلے ملتے۔ گلے ملتے ملتے آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ شہریوں کی بھی اور سپاہیوں کی بھی۔ یہ کون نہیں جانتا کہ سپاہی نے اپنے

اس جوہر کو جو اسے اپنی اسلامی تاریخ سے ورثے میں ملا ہے۔ میدانِ جنگ میں بڑی شان سے آشکار کیا۔ دغا تو کہیں اور ہوئی ہے اور اس دغا کے طفیل آج یہ قوم اپنی تاریخ کے سامنے شرمسار ہے۔ اس کی تاریخ میں اس برعظیم پاک و ہند کی سرزمین پر بہت معرکے ہوئے وقتاً فوقتاً پسپائیاں بھی ہوئیں مگر یہ مردانِ حر کبھی ہتھیار ڈالتے ہوئے نہیں دیکھے گئے تھے۔

اے دوستو یہ جلوس تم کہاں سے نکالتے ہو، کہاں لے جاکر ختم کرتے ہو۔ تمہیں کیا معلوم نہیں کہ لاہور میں علامہ اقبال خوابیدہ ہیں، اور کراچی میں قائدِ اعظم آرام فرما ہیں۔ چلو اور چل کر ان کی روحوں کو پُرسا دو۔ اور اگر کوئی اہلِ دل سکت اور استطاعت رکھتا ہو تو جمال الدین افغانی کے مزار پر جاکر تعزیت کرے۔ ہمارے وہ سب اکابرین آج تعزیت کے مستحق ہیں جن کی فکر و نظر سے اس تصور کی پرورش ہوئی تھی اور ۱۹۴۷ء میں جب اس تصور نے حقیقت کی شکل اختیار کی تھی تو بہت لوگوں کو اس کی خاطر اپنی جانوں سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ بہت گھر تاراج ہوئے اور بہت بستیاں اجاڑ ہوئیں۔ تب کہیں یہ بستی آباد ہوئی تھی۔ ؎

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

لہو کل تک سرحدوں پر بہہ رہا تھا۔ اب وہ اِدھر آنکھ سے ٹپک رہا ہے اور اُدھر ڈھاکہ کی گلیوں میں امنڈ رہا ہے۔ ؎

اے محمد گر قیامت می برآری سر ز خاک

سر برآور ویں قیامت درمیانِ خلق بیں

لاہور میں کوئی دم نہیں جاتا کہ کسی نہ کسی گلی سے کوئی جلوس امنڈا ہوا نہ ہو کبھی جلوس باقاعدہ ہوتا ہے اور شہر کی شاہراہوں پر گشت کرتا نظر آتا ہے کبھی یوں ہوتا ہے کہ غم و غصّے سے بے تاب ہو کر نوجوان نعرے لگاتے ہوئے گلی سے نکلے اور جلوس کی شکل اختیار کر گئے۔

اس وقت بہت غصہ ہے اور بہت غم ہے۔ اس غم و غصہ میں ہم یہ نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ یہ واقعہ کیسے ہُوا اور اب آگے کیا ہونا ہے اور ہمیں کیا کرنا ہے۔ یہ منزل بھی بہرحال آئے گی۔ سارتر نے زوالِ پیرس کے بعد لوگوں کے غم اور غصّہ کو دیکھا اور اپنے ایک حساس کردار کی زبان سے یہ کہا کہ شکست خود سبق نہیں بنتی یہ سبق سیکھنا پڑتا ہے۔ اور غالب نے کہا تھا ؎

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو

ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

فی الحال ہم تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش سے گزر رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس زہرِ غم کو اپنی رگ و پے میں ہم کس طور اتارتے ہیں۔ شکست تو ہو چکی۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم اس شکست کو قبول کس طور پر کرتے ہیں۔ آیا یہ شکست تلخیٔ کام و دہن ہی بن کر رہ جائے گی اور ہم میں شکست خوردگی پیدا کرے گی یا یہ غم رگ و پے

میں اُتر کر ایک آگاہی بنے گا، اور اپنے آپ کو نئے مرے سے تخلیق کرنے میں
ہمارا مددگار رہے گا۔

(۲۰ ۱۲/۷۱)

محشر خیال

سجاد انصاری

سجاد انصاری علی گڑھ سکول کا وہ بے باک اور صاحب طرز انشا پرداز تھا جس کی ندرت اسلوب اور لطف بیان کے سامنے اردو کے بہت کم ادیب ٹھہرتے ہیں۔ محشر خیال اس جوان مرگ ادیب و شاعر کے انمول افکار کا مجموعہ ہے جس کی نثر پر شعر کا گمان ہوتا ہے اور شعر پر الہام کا۔

قیمت بارہ روپے

آئینہ ادب

چوک مینار۔ انارکلی۔ لاہور